بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

اپنے خواب

طبع زاد افسانے

مُصنّفہ

سیّد کاظم علی دہلوی ایڈیٹر "کہکشاں" دہلی

علی بھائی شرف علی اینڈ کمپنی لمیٹڈ
نمبر ۳۷۳ - ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳
قیمت دو روپے چار آنے (عہ)

پرنٹر:- یوسف بھائی ایم بھاترمی
مطبع محمدی گنپاؤڈر روڈ مجگاؤں بمبئی ۱۰
مالکان علی بھائی شرف علی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

دُوسرا ایڈیشن
جون سنہ ۱۹۴۵ء

اِنتساب

خان بہادر نواب محمد ذکاءاللہ خاں صاحب ایم۔ اے (علیگ) ریٹائرڈ کلکٹر بریلی

کے نام

موصوف علم و اَدَب اور کاظم و کہکشاں کے دیرینہ کرم فرما ہیں۔

سیّد کاظم علی دہلوی

فہرست

نمبرشمار	مضمون	صفحہ
۱	انتساب	ج
۲	سُنئے	۳
۳	دیکھئے	۶
۴	پکار	۹
۵	خاکے	۲۹
۶	پرچھائیاں	۵۷
۷	جھلکیاں	۹۴
۸	گونج	۱۲۹
۹	ہار سنگھار	۱۴۵
۱۰	مانگ	۱۵۹
۱۱	نقوش	۱۸۳
۱۲	شگون	۱۹۲

سُنئے

اپنے خواب ۔ اکثر جگانے والے حقائق رکھتے ہیں۔ زندگی کی صحیح تصویریں ہیں اور اخلاق کے معیاری نمونے۔ نیز ہماری زندگی کے مرقّع ہیں نہ کہ یورپ سے مستعار لئے ہوئے خاکے اب جب کہ پروازِ تخیل سے محرُوم پربریدہ قلم طراز اکثر و بشیتر یورپین شورٹ اسٹوریز سے اخذ کردہ افسانے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ ادب نواز مغتنم ہے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی کے نقشے صحیح رنگوں کے ساتھ زیر نظر لاتا ہے۔

دورِ حاضرہ میں شرابِ مغرب گلوئے مشرق میں بطرزِ غریب و بہ اندازِ عجیب اتاری جا رہی ہی اور اس کے ذمہ دار وہ تحریر پیشہ مغرب زدہ اربابِ رقم ہیں جو گرہ کا کچھ نہیں رکھتے اور مالِ مسروقہ کی تجارت میں مصروف ہیں۔ سیّد کاظم کے افسانوں میں ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی پاتے ہیں۔ ہر تحریر پڑھ کر منہ سے بیساختہ نکل جاتا ہی کہ :۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور یہی جانِ ادب ہی۔ یہ زندہ ادیب رُوحِ حیات و روانِ ادب پیش کرتا ہی جبکہ ہم کو اپنی ماں بہنیں بولتی چالتی نظر آتی ہیں نہ کہ لعبتانِ چین و بتانِ فرنگ کہ جن کی سیرت کو ہم سمجھ سکتے ہیں نہ جن کی زبان ہماری زبان ہوتی ہی۔

سیّد کاظم کے افسانوں میں زبان کا لحاظ۔ اخلاق کا پاس اور حفظِ مراتب نظر آتے ہیں۔ یہ مصنف قارئین کو گلشنِ بے خار کی سیر کراتا گذر جاتا ہے اور پھر محض داستان گوئی نہیں کرتا بلکہ ہر افسانہ کسی تخیّل کے ماتحت لکھتا ہے مثلاً "پرچھائیاں" لے لیجئے۔ آج ہماری سوسائٹی پر غریب امیر میں منافرت کے جو تاریک سائے ڈالے جا رہے ہیں یہ اس کا دنداں شکن جواب ہی۔ اور بتاتا ہی کہ

ہندوستان میں غریب امیر تو ہمیشہ رہے لیکن دولت کی زیادتی کبھی وجہ اعزاز اور کمی وجہ تذلیل نہ ہوئی۔ اِس سرزمین پر سدا شرافتِ خاندان اور امتیاز نسلی وجہ تفوق قرار پایا۔ غریب شریف عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور کمینہ نودولتا نظروں پر نہ چڑھا۔ ہماری دنیائے مساوات میں اگر دورِ اوّل میں غلام اونٹ پر سوار اور خلیفہ نکیل پکڑے ہوئے نظر آتا ہے تو دورِ آخر میں بھی بحمداللہ داروغہ جی اور آقا تصویر میں پہلو بہ پہلو بیٹھے ہیں اور داروغہ صاحب کی صاحبزادی منظر نوعمر آقا کی شریک زندگی نظر آتی ہے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ آجکل کے افسانہ نویسوں کی ہیروئن کی طرح حیا سوز چلتر اور چالبازی سے نہیں بلکہ بیش از بیش خودداری کو لئے ہوئے اصولوں کی پابندی کے ساتھ بڑی بیگم کی خوشی سے سات لڑی کے سہرے سے اس گھر کی بہو بن کر آئی۔

یقیناً قابل مصنف کی یہ سعیٔ مشکور قابلِ مبارکباد ہے۔

(آدیبُ الملک) خواجہ محمد شفیع دہلوی بی، اے

دیکھئے

راقم الحروف نے جنوری ۱۹۴۳؁ء میں افسانوں کا پہلا مجموعہ "دل کی باتیں" ڈرتے ڈرتے منظرِ عام پہ رکھا تھا اور خود اپنے نقاد کی گرم نگاہ سے بے رحمی کے ساتھ سب کچھ چھان بین کر رکھ دینے کی اپیل کی تھی۔ کیوں۔؟ آج کل ادب کا بدلا ہوا ماحول ہے۔ بدلے ہوئے صبح شام۔ اور کچھ دستور سا ہو گیا ہے کہ تیسرے درجہ کا نورٌ علیٰ نور مصنف بھی اپنے لفظوں میں اپنی تعریف کرنا ادب برائے زندگی میں شامل سمجھتا ہے۔ خاکسار نہیں چاہتا تھا کہ اس قسم کا ہلکا سا تصور بھی روا رکھا

جائے۔ کون نہیں جانتا کہ سچّا ادب فانی اور زندگی چھُپنے والی چیز نہیں ہے دشمن کی قہر آلود نگاہ بھی موتی کی آب نہیں چھین سکتی۔ خدا کا فضل، دوستوں کی دُعائیں۔ فاضل نقاد نے اس مجموعہ کو زبان و بیان کے لطیف امتزاج کا آیئنہ دار قرار دیا۔ اس کے قلم سے بے ساختہ نکل گیا "دل کی باتیں" واقعی دل کی باتیں ہیں اور اس کے مصنّف کو چوٹی کے افسانہ نگاروں میں شریک کیا جا سکتا ہے یہ سب خوشی کی باتیں ہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ راقم الحروف کسی درجہ میں بھی مغرور نہیں ہے اور ہنوز اپنے آپکو مبتدی سمجھتا ہے۔ افسانہ نگار سچ مچ بڑی چیز ہوتا ہے۔

آپ نے خواب ۔۔۔ ؟ یہ نیا مجموعہ بھی طالب علمانہ حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں کس پائے کے افسانے شامل ہیں؟ اِس سوال کا جواب بھی لائق نقاد کا قلم دے سکے گا۔

سیّد کاظم علی دہلوی

آزادی برقرار رکھنے کے لئے پروں سے بھی کام لیا جاتا ہے اور پرواز سے بھی۔ لیکن حیات کچھ حادثوں ہی کا نام تو ہے۔ بعض اوقات زمانے کی ایک کروٹ انسان کے لئے دنیا میں کوئی دلکشی باقی نہیں رکھتی۔ اور اُسے تغیرات کے شکنجے میں کس کر رونے اور مسکرانے کی حد سے دُور پہنچ کر دم لیتی ہے۔ اور وہ زندگی اور خودکشی دونوں کو ناگہانی بلائیں سمجھ کر خود بخود قفس میں بند ہو جانے ہی کو زندگی جاننے لگتا ہے۔ کملا کی تمام زندگی بھی سیر و تفریح۔ بناؤ سنگھار۔ اور آرام آسائش سے گذر کر کتابوں میں سمٹ آئی تھی۔ پڑھنا

پڑھے جانا اور اپنے آپ کو کرداروں، افسانوں اور کتابوں میں ڈھونڈنا اس کے لئے بہترین مشغلہ تھا۔ وہ گہرے رنگ کی محبت بھری کہانیاں شوق سے پڑھا کرتی خصوصاً وہ کہانیاں جن میں گھریلو زندگی نمایاں ہوتی اور میاں بیوی کی حرف و حکایت پر خوش اسلوبی کے ساتھ بحث کی جاتی۔ افسانے کا کردار تھوڑی دیر کے لئے دل میں چٹکیاں سی لیتا اور کوئی شے چپکے چپکے کان میں کہنے لگتی "بیوی کو سراپا محبت ہمہ تن بہار بنا نا شوہر کا حصہ ہے" لیکن وہ فوراً ہی رُخ پھیر کر اپنی طرف دیکھتی۔ کچھ تلملاتی، سہمتی، تڑپ تڑپ جاتی، آنکھوں میں آنسو جھلک جاتے اور بھیگی ہوئی رات کی طرح پلکیں بھیگ جاتیں۔

اس کا شوہر ڈاکٹر کیلاش اپنے شہر کا نامور ڈاکٹر اور اپنی سوسائٹی کا معزز فرد تھا۔ دولت۔ عزت۔ شہرت اور اس قبیل کی تمام چیزیں اس کے پاس تھیں اور وہ دن بدن اعزاز و اکرام کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ لیکن جتنا وہ آگے بڑھتا رہا۔ اتنی ذمہ داری محنت مصروفیت بڑھتی گئی۔ ہر وقت مریضوں کی یورش۔ سیٹھوں، ساہوکاروں کی کوٹھیوں پر لے جانے والی موٹروں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ۔ پھر ڈاکٹر کیلاش جاگتے ہوئے دل و دماغ کا آدمی تھا۔ ہنستی روتی زندگیاں روزانہ اس کی نظر سے گذرتی تھیں۔ وہ نچلے طبقہ کی خدمت سے کیوں باز رہتا۔ اوّل تو سنجیدہ مزاج تھا ہی، دوسرے بڑھے ہوئے منصب، بڑھی ہوئی مصروفیت نے اور بھی زیادہ سنجیدہ بنا دیا تھا۔ کملا اس کی خوب رو بیوی تھی اور اُس نے جان سے بھی زیادہ اُسے عزیز رکھا تھا اس کی خواہش تھی کہ کملا کا دل میلا نہ ہو اسی وجہ سے ہر طرح کی بے فکری ہر طرح کا عیش مُہیّا کیا گیا تھا اور شوہر نے سچ مچ دنیا سمیٹ کر اس کے پاؤں میں ڈال دی تھی۔ مگر اس کے باوجود کملا بشاش نظر نہ آتی تھی۔ کیلاش نے کچھ ہی دنوں پہلے اسے شباب و شعر کا دل فریب مجسمہ پایا تھا۔ اور

بڑی کوشش کے بعد دل کی رانی بنا کر لایا تھا۔ لیکن بہت جلد کملا کی ہوش اُڑانے والی شوخی نہ سمجھ میں آنے والے چڑچڑے پن سے بدل گئی۔ کیلاش کا زیادہ وقت ہسپتال میں صرف ہوتا اور صبح کے تین گھنٹے کوٹھی میں گذرتے۔ اِس عرصہ میں وہ کوشش کرتا کہ کملا ہنسے ہنسائے اور چاند سے چہرے پر تر و تازگی برسے۔ لیکن وہ ہر وقت بگڑی بگڑی سی رہتی۔ اور عمل سے ناراضگی ہی ناراضگی کا اظہار ہوتا۔ کبھی کبھی کیلاش بددلی کا سبب نرمی اور محبت سے پوچھتا مگر وہ طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے چُپ ہو جاتی۔ ڈاکٹر کیلاش بیوی کے متعلق کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر اس کے مشاغل سوچ بچار کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اور اب اس کا کام یہ رہ گیا تھا کہ صبح تین گھنٹے تک بیوی کا منہ دیکھتا رہے اور پھر سارے دن مریضوں کی نبضیں۔

کملا بلا کی حسین بھی تھی اور شوخ و شرربار بھی۔ اس کی اداؤں میں کفر تھا۔ نگاہوں میں جوانی کا رَس، نشہ اور جادُو۔ وہ جس قدر خوب صورت تھی اُسی قدر شوخ بھی۔ تتلی کی طرح پھولوں میں گھومنا اور سارے چمن میں زندگی بکھیرتے پھرنا اس کا معمول تھا اور بات بات میں بگڑ جانا۔ روٹھنا اور پیہم روٹھے رہنا اس کی فطرت۔ وہ چاہتی تھی کہ ہر وقت رُوٹھی رہا کرے اور کوئی ہاتھ جوڑ کر، پاؤں چُھو کر اور گلے میں باہیں ڈال کر اُسے مناتا رہے۔ جب وہ ادائے خاص سے ناراض ہو کر روشن پیشانی پر بل ڈال لیتی تو فطرت کو بھی اس برہمی پر پیار آجاتا۔

شادی سے پہلے کملا اپنے کالج میں بہار بن کر رہی تھی۔ اور بہت سی طرح دار جوانیوں نے سچ مچ اُسے دیوی بنا کر پوجا تھا اور اُن کی نگاہوں، کتابوں اور دل کے آئینوں میں کملا کی تصویر موجود رہتی تھی۔ اور پھر ایک نوجوان نے تو اپنے آپ کو اُس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ جب اُس خرابِ محبت نے آنکھوں میں آنسو بھر کر پہلی بار محبت کی بھیک مانگی

تھی تو بالادست کملا کے دل میں بھی ایک قسم کی پھانس سی چُبھ گئی تھی۔ اور وہ سٹپٹا کر ایک دم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اُس نوجوان کے ہونٹوں پر بارہا تبسم بھی دیکھا گیا تھا اور شگفتگی بھی لیکن اس حادثہ کے بعد پھر کبھی وہ خوش نظر نہیں آیا۔ اور ہمیشہ چہرے پر مایوسی، اُداسی اور بیکسی چھائی رہی۔ وہ غریب تھا۔ دل شکستہ۔ دل کی بغاوت سے مجبور۔ ورنہ اتنی حسین سرمایہ دار لڑکی کا تصوّر بھی نہیں کرتا۔ کملا کبھی کبھی تنہائی میں اُس کے متعلق سوچا کرتی تھی۔ اور اس کا بھولا بھولا معصوم چہرہ دِل نوازی کی اپیل کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ کملا کا دِل نرم ہو چلا تھا اور وہ بھی اُس غریب نوجوان کا خیال کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اور اکثر غور کرتی تھی کہ اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا جائے۔ نوجوان کی غریبی اس رستے میں ایک ایسی رُکاوٹ تھی جو کملا کو پریشان کئے ہوئے تھی۔ اس کی نظر میں شاندار زندگی کا نقشہ تھا۔ جگمگاتا ہوا مستقبل۔ اور وہ اپنے سنہری بتوں کو اپنے ہی پیروں سے کچلتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ ٹھیک اُس دَور میں جب وہ احساسی کشمکش میں مبتلا تھی اور بہت جلد کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچنے والی تھی۔ اسکے سامنے ڈاکٹر کیلاش کا نام رکھا گیا۔ ڈاکٹر کے پاس مال دَولت، نوکر چاکر، موٹر، بنگلہ اور نام نمائش کی تقریباً سب چیزیں تھیں اُ کملا نے حسین زندگی کے جو حسین خواب دیکھے تھے ان کی اچھی خاصی تعبیریں بن سکتی تھیں۔ آخر اس نے خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر ڈاکٹر کیلاش کو پسند کر لیا تھا۔ اور اس غریب نوجوان کو اس شان سے بُھلا دیا تھا جسے وہ یاد کرنا بھی چاہے گی تو بھی یاد نہ کر سکے گی۔ مگر فطرت شاید ایسے ہی وقت بے ساختہ مُسکرایا کرتی ہے۔ کملا سمجھی تھی کہ اُس نے زمانے کی مسرتیں سب طرف سے چھین کر اپنے آنچل میں باندھ لی ہیں اور اپنی دنیا کو خزاں کی تمام شورشوں سے بچا کر اس سرے سے اُس سرے تک بہار بنا لیا ہے۔ بظاہر اس کا سودا بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ اس نے تو زندگی کو بہت اچھی قیمت

پر فروخت کیا تھا۔ مگر کملا کچّی کلی ہی تو تھی اُسے ایک دم نسیمِ سحر کی لطیف گُدگُدیوں کا راز کیونکر معلوم ہو جاتا۔

کیلاش نے کملا کو عروج و آسائش کے لحاظ سے جو کچھ دیا وہ اس کی توقع سے بھی زیادہ تھا۔ لیکن وہ اُس کی پُر جوش زندگی کا ساتھ نہ دے سکا۔ کملا حسن و نشاط۔ راز و نیاز اور وہ کچھ چاہتی تھی جو حسین بے حد حسین لڑکیاں شوہر سے چاہا کرتی ہیں۔ پر کیلاش دیرینہ متانت اور پیشہ کی مناسبت کی وجہ سے کملا کو صرف بیوی سمجھتا تھا۔ یہ صورتِ حال اسے بددل کرتی رہی۔ آخر ایک دن ذہن و فکر کی شکست نے امیدوں کے سارے شیش محل توڑ پھوڑ کر برابر کر دئے۔ اور کملا نے بھی دونوں دونوں پیروں سے زندگی کو ٹھکرا دیا اور سب کچھ بھول کر کتابوں میں غرق ہو گئی۔

اب مایوس کہانیوں۔ تمثیلوں اور تصویروں میں اُسے وہ مغموم نوجوان روتا ہُوا دکھائی دیتا تھا۔ جسے وہ اپنے ہاتھوں سے مٹا چکی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی وہ کانپتی، کلپتی۔ غمگین ہو جاتی اور بے تاب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ کبھی شوہر کی بے پروائی پر بے انتہا غصّہ آتا۔ کبھی بے تحاشہ اپنے بال نوچ ڈالنے کو جی چاہتا۔

کہتے ہیں کیلاش بہت ہی اچھا ڈاکٹر تھا۔ دل کی تمام بیماریوں کا آزمودہ کار معالج وہ نبض پر ہاتھ رکھ کر، آلے لگا کر لوگوں کے دُکھ سُکھ کا حال بتا دیا کرتا تھا اور سینکڑوں مریض شفایاب ہو کر دُعائیں دیتے ہوئے واپس ہو جاتے تھے۔ اس کے پاس بہت سے ڈاکٹری آلے تھے جن کے ذریعہ جسم کے تمام حصّوں کا حال معلوم کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس کے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں تھا جس سے کملا کے دُکھ کا سُراغ مل جاتا۔ اس نے کتابوں میں پڑھا تھا

کہ دل کی دھڑکن کس طرح دُور کی جاتی ہے اور دل کی کم زوری کا کس طرح علاج کیا جاتا ہے
مگر اس نے یہ کہیں نہیں پڑھا تھا کہ بجھا ہوا دل شاداب کیوں کر ہوتا ہے۔ اور ٹوٹے ہوئے
دل کے ٹکڑے ملا کر کس ترکیب سے جوڑا کرتے ہیں۔ کملا جس رفتار سے بیگانگی اختیار کرتی
گئی اسی رفتار سے کیلاش راحت کے سامانوں میں اضافہ کرتا گیا۔ پھر بھی کملا کا دل قیمتی
ساریوں۔ آویزوں اور فرانسیسی عطر کی شیشیوں میں نہ اٹکا کیلاش نے شادی سے پہلے
اور شادی کے بعد بھی یہی سمجھا تھا کہ بیوی کو اچھی کوٹھی میں رکھنا۔ روپے پیسے سے بے فکر
کر دینا۔ صبح کچھ دیر گھر میں جی بہلا کر سارا دن ہسپتال میں روپیہ کمانا ہی زندگی ہے۔ مریضوں
کو دیکھتے ہوئے وہ روزانہ کملا کو ٹیلی فون پر بُلا کر مزاج پُرسی کر لیتا تھا۔ مگر اس نے کبھی بیوی
کا ہاتھ پکڑ، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، چھیڑ کر۔ ستا کر، پاس بیٹھ کر مایوسی کا سبب نہیں
پوچھا تھا۔ اس نے تو شاید کملا کو بھی ایک مریض جان لیا تھا اور وہ سوچ سمجھ کر بتدریج اس کا
علاج کر رہا تھا۔ اگر ڈاکٹر کیلاش کے سے فکر کا آدمی درمیانی طبقے کی کسی الھڑ دوشیزہ کو
گلے کا ہار بنا لیتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اُسے روزانہ بیوی کو ٹیلیفون کرنے کی زحمت اُٹھانی
پڑتی۔ لیکن کملا! وہ تو اپنے کالج کی ہونہار طالبہ، اونچے گھر کی اونچی پیشانی والی بیٹی،
نئی تہذیب کی ترقی یافتہ لڑکی تھی۔ اور جینے اُبھرنے اور اُجاگر ہونے کے تمام انداز اس کی
نظر میں تھے۔

کملا ابھی ابھی کھانا کھا کر آرام کرسی پر لیٹی تھی اس کے ہاتھ میں کسی باغی ادیب کی
تازہ تصنیف تھی جس میں سماج، سیاست، ادب اور معاشرت کی جاں گسل بدعنوانیوں پر
اس ڈھنگ سے آتش باری کی گئی تھی۔ کہ پڑھنے والا کانپ کانپ اُٹھتا تھا۔ اور پھر کملا
تو بپھری ہوئی حسین عورت تھی اور رومان آفریں کہانیوں نے اُس کے دل میں جو ہلچل پیدا

کی بھی۔ وہ ہنگامی صورت اختیار کر چکی تھی۔ وہ کتاب پڑھتی رہی اور چہرہ پر غصہ کی لہر دوڑتی رہی
اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ اس طرز کی تحریروں سے تہذیب وتمدن کے منہ پر پڑے ہوئے
خوشنما پردوں کو اُتار کر افراد۔ طبقات اور جماعات کو جس منظر پر چاہے عُریاں کر دے۔ مگر کملا
اونچے گھر کی لڑکی تھی۔ اونچے خیال کی سہیلیوں سے سابقہ پڑا تھا۔ اچھے ماحول میں پل بڑھ کر
پروان چڑھی تھی۔ اس کے پاس فولادی عزم کہاں سے آتا۔ وہ رچی ہوئی رسموں اور بچے ہوئے
فرسودہ رواجوں کو توڑنے کی جرأت کیسے کرتی۔ اس کی طبیعت میں شوخی بھی ضرور تھی اور
سوچنے سمجھنے کی اُپج بھی۔ مگر گھریلو شائستگی سے ملی جُلی۔ اُس نے نڈھال ہو کر کتاب بند کر دی
اور آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگی۔

"کملا" کسی نے نرم لہجہ میں آواز دی۔

دوپہر کے وقت کیلاش کوٹھی میں؟ کملا نے شوہر کی آواز کو حیرت کے ساتھ سُنا۔
اور چُپ چاپ آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔

کملا ـــــ کیلاش نے پھر آواز دی

اُس نے تمکنت سے آنکھیں کھولیں اور شوہر کے ساتھ ایک اجنبی نوجوان کو دیکھ کر
کُھلے ہوئے بال سنبھالتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

میرے خالہ زاد بھائی، کشور بابو، اکسائز انسپکٹر آج ہی تبدیل ہو کر ہمارے شہر
میں آئے ہیں۔

یہ تمھاری بھابی کشور، کملا کماری بی، اے۔ بہت متین، بہت ہی سنجیدہ۔ کیلاش
کے لفظوں میں فریاد تھی۔

آپ سے بھی زیادہ بھیا؟ کشور نے خاص انداز سے مُسکرا کر کہا۔

جی —— کیلاش کے مُردہ ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ آگئی

سر جھکا کر سلام کرتے ہوئے کشور نے کملا پر ایک نظر ڈالی۔ گویا وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کس قسم کی سنجیدگی چہرے پر بکھری ہوئی ہے۔

اُدھر بھائی کو کوٹھی کی سج دھج دکھانے کے لئے کیلاش اندر کے حصّہ میں لے گیا۔

——اِدھر کملا نے اپنے آپ کو ماضی کے آئینے میں جھانک کر دیکھا —— جیسے وہ خراماں خراماں فتنے کچلتی کالج روانہ ہوگئی ہے۔ زندگی سر جھکائے ساتھ ساتھ ہے۔ جوانی راہ میں پھول بکھیرتی ہوئی آگے آگے چل رہی ہے۔ بہت سی ارمان بھری نگاہیں اُس کے قدموں میں لوٹ رہی ہیں۔ وہ جس طرف دیکھ لیتی ہے آگ سی لگا دیتی ہے۔ لوگ اُسے دیکھتے ہیں۔ لرزتے ہیں سہمتے ہیں۔ کانپ کانپ جاتے ہیں۔ وہ گرد و پیش سے بے نیاز ہے اور محبّت زدہ نوجوان ٹھیک اسی طرح سر جھکا کر اُسے سلام کر رہے ہیں جس طرح کشور نے اُسے سلام کیا ہے۔ کملا کے دل سے ایک چیخ بلند ہوئی اور اس کی مدھ بھری آنکھیں دیوار پر جم کر سینے میں اُٹھتے ہوئے طوفان کی بے بسی پر پُر نم ہوگئیں۔ کملا کی لمبی لمبی پلکیں لرزتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ پھول سے رخساروں کو چھُو رہی تھیں اور اُسے یاد آرہا تھا کہ آشفتہ مزاجی سے پہلے وہ رنجیدہ نوجوان بھی کشور کی طرح مسکرا کر باتیں کیا کرتا تھا جس کی ہنسی، دل بستگی اور زندگی کملا اپنے جہیز کے ساتھ سمیٹ لائی تھی۔

جب تک کوئی معقول انتظام نہ ہو یہ ہمارے ہاں ہی رہیں گے! کیلاش نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

جی —— کملا نے سُنا بھی اور نہیں بھی سُنا۔

کشور نے تنہائی میں کیلاش اور کملا کو تصور کا سہارا دے کر پاس پاس کھڑا کیا سوچا سمجھا غور کیا اُسے ایک طرح کی سنجیدگی اور شگفتگی کا بے محل سنگھم نظر آیا۔ وہ عُمر میں کیلاش سے پانچ چھ سال چھوٹا تھا مگر بچپن میں ساتھ کھیلا کودا، ساتھ لکھا پڑھا تھا۔ اُس کی نگاہ میں کیلاش کا پورا نقشہ پھر گیا۔ وہ روکھی پھیکی طبیعت۔ اسی روش کے دوست احباب۔ اسی قماش کی تعلیم و تربیت اور پھر اس سے کہیں زیادہ قدامت پسندی اور خشک کامی ——— کملا کو اس نے صرف ایک نظر دیکھا تھا۔ مگر ذہین آدمی تھا۔ بلند خیال۔ اکسائز انسپکٹر۔ تمام نشیلی چیزوں کا ماہر ——— کیلاش کے الفاظ میں وہ بہت ہی متین۔ بہت ہی سنجیدہ تھی۔ مگر کشور کو شبہ تھا کہ اس شان کی سیمیں پیکر پری چہرہ گریجویٹ لڑکی کیلاش کے ساتھ رہ کر تو پژمُردگی کا شاہکار بن سکتی ہے مگر طبعاً بے رُوح محبت کی حامی نہیں ہو سکتی۔ اس نے کیلاش اور کملا کے رنگ رُوپ میں طنز کرتی ہوئی بے جان زندگی پائی۔ وہ بیٹھا نہ رہ سکا اور اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے دونوں پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ ایک دوسرے کے لئے خودکشی کا عنوان بن کر ایک مرکز پر جمع ہونا اور پھر ماحول کے مُطابق مزاج نہ بدلنا کیا معنی رکھتا ہے؟ معاً اسے خیال آیا کہ کیلاش رچی بچی دُنیا اور بہت سے روپوں کا مالک ہے اور اسے سماج کی طرف سے ہر قسم کے کفر کی اجازت دے دی گئی ہے۔ وہ سماج سے پُوچھے بغیر شادی بھی کر سکتا ہے محبت بھی۔ اور۔ وہ کچھ بھی جس پر عام لوگوں کو موت سے پہلے مرجانے کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ لیکن کملا۔ ؟ وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکا۔ اُسے تہذیب کی زندہ لاش پر شیطانی بال و پر کے ساتھ بہت سے گِدھ منڈلاتے ہوئے نظر آئے۔ اور اسکی اوٹ میں سینکڑوں دم توڑتی ہوئی جوانیاں، آہیں۔ آنسو، حادثے۔ خون اور خودکشی۔

کملا کو ذاتی طور پر کوٹھی کی دیکھ بھال سے کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی رَسے بسے گھر کی ہو بیٹھی تھی۔ اور مہمان کی تواضع فرائض میں داخل تھی۔ مجبوراً کمروں کو سنوارنا پڑا اور اپنے آپ کو بھی، اب نہ وہ بال بکھیرے ہوئے بیباکی سے افسانے پڑھ سکتی تھی نہ گھر کے ہلکے پھلکے کاموں سے ہاتھ روکا جا سکتا تھا۔ صبح کی چائے۔ سہ پہر کا ناشتہ۔ کمروں کی صفائی۔ وقت کی پابندی۔ نوکر چاکر سبھی موجود تھے۔ پر گھر کی رانی بغیر گھریلو حکومت کا کوئی شعبہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ رفتہ رفتہ چیزیں قرینے پر آئیں۔ کام وقت پر ہوئے۔ جی بہلا ہوش ٹھکانے ہوئے۔ سکون نے کروٹ بدلی۔ زندگی قریب آئی۔ پراگندگی دُور ہوئی اور زندہ دلی نے انگڑائیاں لینی شروع کیں۔ کملا حسین تھی۔ کیف وخمار کا دلنواز مجموعہ چند روز کی اُلٹ پھیر میں حسن کی تمام رعنائیوں نے بیدار ہو کر چہرے مُہرے۔ قد قامت اور تن من کو سرتاپا بہار بنا دیا۔

کیلاش کو بیوی کی بدلی ہوئی حالت سے بہت خوشی ہوئی۔ اور اس نے کشور کی آمد کو رحمت جان کر اُسے احسان مند نگاہوں سے دیکھا۔

کملا خوش تھی کہ اُسے بولنے بات کرنے کے لئے ڈھنگ کا ساتھی مل گیا۔ کشور کی زبان میں لوچ تھا اور باتوں میں وہ بات جس سے اس کے کان برسوں آشنا رہے تھے۔ فرصت کے وقت وہ کشور سے باتیں کیا کرتی۔ اِدھر اُدھر کی مختلف باتیں۔ کبھی سیاسی مسائل زیرِ بحث آتے۔ کبھی علمی ادبی اور ٹھیٹ معاشرتی۔ اُن کی راہیں جُدا جُدا تھیں مگر خیال ایک زبان ایک رُجحان ایک تھا۔

کشور نے کملا کی مایوسی اور چہچہاتی دونوں کو حیرت سے دیکھا۔ عورت اور نشہ ایک ہی چیز کے دو نام بنائے جاتے ہیں۔ وہ ذہانت کا پُتلہ تھا۔ اکسائز انسپکٹر بھی۔ لیکن

بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود یہ غنچۂ سربند اُس کے لئے معمہ ہی رہا۔

کملا ایک کتاب میں اس طرح کھوئی ہوئی تھی کہ اُسے کشور کے آنیکی بالکل خبر نہ ہوئی۔

آپ شام کے وقت بھی سیر کو نہیں جاتیں۔؟

کملا چونکی۔ سنبھلی اور شرما سی گئی۔

جی نہیں چاہتا ——؟

یہ بات نہیں ہے۔!

پھر ——؟

اکیلے ......!

اوہ، کشور نے ہنس کر کہا۔ بھیّا؟ وہ تو اگلے وقتوں کی مٹّی سے بنے ہیں لیکن یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ انسان ایک جگہ بند ہو کر بیٹھ جائے؟

کیا کِیا جائے۔ ——؟ کملا کے لب ولہجہ سے حسرت ٹپک رہی تھی۔

بغاوت ——!

کملا بھی بلا سوچے سمجھے ہنس پڑی۔ اور کشور بھی مسکرا دیا۔

آپ کالج کے زمانے میں بھی اسی طرح رہتی تھیں۔؟ کشور نے دُکھتی رگ پکڑی۔

جی نہیں۔!

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر ظلم کیا جا رہا ہے۔؟

کملا کے دل کے تار زور زور سے بجنے لگے۔

بھیّا کا ہاتھ پکڑ کر صاف صاف کہیئے۔ دولت اپنی تجوری میں بند کر کے رکھو مجھے

زندگی چاہیئے زندگی ۔!!

اُن کے دل پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا ۔ ؟

مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ بھیّا کے پاس دل ہے بھی یا نہیں ۔ !

کملا کے احساس پر چوٹ سی لگی ۔ !

رنجیدہ ہو گئیں ۔ چلیئے میں اُن کو کچھ نہیں کہوں گا ۔ بہت خیال رکھتے ہیں آپ کا ؟

جی ۔ یہ ساز و سامان اُن ہی کا دیا ہوا ہے ۔ !

اور یہ قید بھی ـــــــ ؟

یہ تو قسمت میں لکھی ہوئی تھی ۔ !

ہمّت ہونی چاہیئے ۔ قسمت کا لکھا بھی بدل جاتا ہے ۔ !

شاید ۔ لیکن ہندوستانی عورت کی ـــــــ قسمت صرف ایک دفعہ لکھی جاتی ہے اور پھر بدلا نہیں کرتی ۔ !

آپ نے اس ترقی کے دَور میں پرورش پائی ہے ۔ کتابوں میں سب کچھ دیکھا ہے انگریزی بھی پڑھی ہے ۔ !

لیکن میں انگریز تو نہیں ہو گئی ہُوں ۔ !

بی ۔ اے میں آپ کے پاس فلسفہ تھا ۔ ؟

نہیں تو ـــــــ !

پھر بھیّا سے سبق لیا جاتا ہو گا ؟

ہاں ۔ کملا فکر مند تھی ۔ مگر کشور کے لطیف اشارے ہنسنے پر مجبُور کئے دیتے تھے ۔

چائے پیجیئے گا ـــــــ ؟

شکریہ۔ میں سیر کو جانا چاہتا ہوں۔ اور آپ بھی چلیں گی۔؟

میں —— ؟

جی ہاں۔ اطمینان رکھئے میں آپ کو کھونے نہیں دوں گا۔!

کملا زیادہ اصرار نہ کرسکی۔ اور دونوں خوشی خوشی پارک پہنچ گئے۔ تقریباً دو گھنٹے تک یکساتھ ٹہلتے پھرتے اور گھومتے رہے۔ فضا اور ہوا دونوں میں ٹھنڈک تھی۔ ہر طرف مسرّت کا دَور دَورہ تھا۔ طبیعت بحال ہوئی۔ آنکھیں سی کھُل گئیں۔ جب وہ سیر کرکے واپس ہوئے تو پارک کے ایک چوکیدار نے دوسرے سے کہا "کتنی اچھی جوڑی ہے پردیسی معلوم ہوتے ہیں"

جیسے سچ مچ کملا کے پیروں سے زمین نکلی جارہی ہو۔

کشور کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اُسے ہوا میں اُڑائے لئے جارہا ہے۔

وہ اپنے کمرے میں رات کو لیٹی تو خلافِ معمول جلدی نیند آگئی۔ خیالات کا وہ اُلجھاؤ جو نیند۔ سکون اور ہوش اُڑایا کرتا تھا اب پوری طرح دُور ہوچکا تھا۔

کشور رات کو بستر پر لیٹا تو اس کی آنکھوں میں مطلق نیند نہیں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سوچے چلا جاتا تھا کہ کملا کتنی حسین لڑکی ہے اور کس قدر مہربانی سے پیش آتی ہے۔ کشور نے بہت سی لڑکیوں کو دیکھا تھا اُن سے باتیں بھی کی تھیں پر کملا کے سے تیور، کملا کی سی ادائیں اور نگاہیں کسی میں نہیں پائی تھیں۔ پھر اس درجہ حسین لڑکی پر اتنا ظلم کہ اُسے دل مسوس کر رہ جانے پر مجبور کیا جائے۔ کشور کے دل میں ہمدردی تھی اور ہمدردی کے بالکل قریب محبت جلوہ فرما۔ اسے معلوم تھا کہ کیلاش اور کملا مرتے دم تک نہ ٹوٹنے

والے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے محبت بھرے دماغ نے یہ اصول اور نظریہ تخلیق کیا تھا۔ کہ نوجوان کو خدا نے مضبوط ہاتھ اسی لیئے عطا فرمائے ہیں کہ جو غلط بندھن نظر آئے۔ اُسے توڑ مروڑ کر رکھ دیا جائے۔ اُس کے سامنے مذہب بھی تھا۔ اخلاق بھی تھا۔ اور سوسائٹی بھی۔ مگر وہ تو ہمدردی کا سہارا لے کر کانٹوں کی ہر جھاڑی سے گذر جانا چاہتا تھا۔

شوہر کے تغافل نے کملا کے دل میں جو آگ لگائی تھی اس کا تقاضہ تھا کہ کیلاش کے طرزِ عمل پر کڑی نکتہ چینی کی جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ جی کھول کر شوہر کو بُرا بھلا کہے۔ دوش دے۔ الزام رکھے اور جس طرح ممکن ہو دل کی بھڑاس نکالے۔ لیکن اس کے لئے ایک غمگسار ساتھی کی ضرورت تھی۔ اور کشور نے اس فرض کو اس شان سے انجام دیا تھا کہ کملا کے دل کی کلیاں سی کھل گئی تھیں۔ کشور کی زبان میں نرمی تھی بیان میں سحر کاری، وہ کیلاش کے ایک ایک کم زور پہلو کو سامنے رکھتا اور فنکار کی سی چابکدستی کے ساتھ اعتراض ٹھونکتا چلا جاتا وہ چپکے چپکے مسکراتی رہتی اور اس کا مقصد حل ہوتا جاتا۔

جس پیمانہ پر کیلاش کے خلاف لعنت کی بوچھار ہوتی رہی۔ اُسی پیمانہ پر کملا کشور کی آؤ بھگت کرتی رہی۔ اُس کی چائے کا خیال بھی رکھا جاتا۔ کھانے۔ ناشتے اور آرام کا بھی۔ اوّل رشتہ دار۔ دوسرے ہم سن۔ ہم مذاق۔ تیسرے اُس کی دبی ہوئی چوٹوں کا جاننے والا۔ جس قدر خوشگوار سلوک کیا جاتا کم تھا۔

جس انداز سے کملا جھکتی گئی کشور کی تمنّا بلند ہوتی گئی۔ وہ سارا کھیل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر خیال آتا کہ کملا کسی بات پر "نہیں" کہنا نہیں جانتی۔

جہاں لے جانا چاہتا ہوں۔ بے تکلف چلی جاتی ہے۔ جو کچھ کہتا ہوں۔ شوق سے سُنتی ہے۔ ہنستی ہے مسکراتی ہے اور شرما شرما جاتی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک دن حد سے گذر کر دل کی بات زبان پر اور سر کملا کے پاؤں پر رکھدے۔

کشور اور کملا سینما گئے ہیں تو بوندیاں پڑ رہی تھیں مگر جب واپس ہوئے ہیں تو خوب مینہ برس رہا تھا وہ قدم بڑھا کر چلے اور کار تک پہنچتے پہنچتے بھیگ گئے۔ کملا کی سُرمئی ریشمی ساری مرمریں جسم اور گداز بانہوں پر پیوست ہو کر بہار کی دلفریب جھلک بن گئی تھی۔ جیسے اُودی اُودی گھٹاؤں میں بجلی چمک کر ضیا بار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سر پر پڑے ہوئے سُرمئی آنچل میں کملا کا شبنمی چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اُس کی پیشانی سے پانی کے قطرے ڈھلک ڈھلک سینے پر گر رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فطرت جھوم جھوم کر موتی بکھیر رہی ہے۔ کشور نے کملا کے مجسّمے کو کفر بھری نگاہ سے دیکھا۔ موٹر چلاتے چلاتے اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اچانک کار رُکی اور کملا نے گھبرا کر کشور کی طرف دیکھا۔ اُس پر ایک طرح کی اضطرابی کیفیت طاری تھی۔

کیا بات ہے۔؟

کشور نے بہت چاہا کہ کملا کا ہاتھ اپنے جلتے ہوئے سینے پر رکھ لے۔ مگر ہمت نہیں پڑی۔

گاڑی خراب ہو گئی ہے۔؟

شاید۔ کشور نے سنبھل کر جواب دیا۔

کار پھر روانہ ہو گئی۔ وہ سارے راستے فکرمند رہا اور خوف و محبت بُری طرح

دامنگیر رہے

کشور صدر دروازے کی بجائے گیرج میں کار لے گیا۔کملا ساری کے دونوں کونے انگلیوں میں دبائے ہوئے اُتری۔کشور اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کملا"——؟ اُس کی آواز میں بوجھ تھا۔

کملا نے نگاہ اونچی کی۔کشور کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اُن کے ساتھ التجا!

کملا حیران تھی -!

کشور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کلیجے سے لگانا ہی چاہتا تھا کہ کملا سٹپٹا کر پیچھے ہٹ گئی

کشور——؟؟؟ اُس کے ماتھے پر کئی شکنیں تھیں۔

کملا——؟؟؟ کشور کی زبان لڑکھڑا گئی۔

آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے۔؟

مَیں مرجاؤں گا کملا۔!

وہ غصے میں بھری ہوئی چلی گئی اور کشور پریشانی کے عالم میں دیکھتا رہ گیا۔

کملا اپنے کمرے میں پہنچی تو اُس پر وحشت سی طاری تھی۔چہرہ سُرخ۔بدن گرم، مزاج برہم۔کھڑے چین تھا نہ بیٹھے۔گہری بے چینی کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔اگر اس کا بس ہوتا تو سچ مچ در و دیوار کو ڈھا کر رکھ دیتی۔آخر وہ نڈھال ہو کر آرام کرسی میں سما گئی۔سر میں سخت درد تھا آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان—— تھوڑی دیر بعد اطلاع ملی کہ کہیں سے ٹیلیفون آیا ہے وہ دل میں نفرت کا بوجھل جذبہ لے کر اٹھی۔ٹیلیفون پر بلانے والا سوائے کیلاش کے اور کون ہوسکتا تھا۔اور اس سے چند خشک باتوں کے سوا کسی اچھی بات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔کملا کو کیلاش پر پہلے سے بھی زیادہ غصہ آنے لگا۔

اُسے پینے۔ گھونٹنے اور زندہ درگور کرنے والا وہی تو تھا۔

فرمائیے۔ مَیں کملا بول رہی ہوں۔ ؟

مجھے اس بدعنوانی کا افسوس ہے کملا۔!

جی۔ میں نے آپ کی عزّت کی۔ اعتماد کیا۔ اپنوں کی طرح پیش آئی۔ مگر آپ نے میری بے عزّتی...... !

بے عزّتی ـــــــ ؟

جی ہاں۔ بے عزّتی۔ ایک شادی شدہ عورت کی اس سے زیادہ اور کیا توہین ہو سکتی ہے۔؟

اگر ایسی بات تھی تو آپ نے حوصلہ افزائی فرما کر غلط فہمی میں رکھنے کی کوشش کیوں کی۔؟

غیر تعلیم یافتہ لڑکیوں کی طرح میں بھی بے رُخی سے کام لیتی۔ غیروں کا سا سلوک روا رکھتی۔ لمبا سا گھونگٹ نکال کر بات کرتی۔ یہی مطلب ہے نا۔؟ آپ پڑھی لکھی عورتوں کو عام انسانی سطح پر دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ اگر علیحدہ کمرے میں ڈال دیا جاتا ہو پلٹ کر بات نہیں پوچھی جاتی ہو تو آپ موجودہ تعلیم و تربیت اور سوسائٹی پر طنز فرماتے ہیں اور اگر شریف انسانوں کی طرح خاطر مدارات کی جاتی ہے۔ دُھوپ چھاؤں کا خیال رکھا جاتا ہے تو غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

آپ بھول رہی ہیں۔ کیلاش سے۔ کیلاش کے عمل و افکار اور گھر بار سے آپ کو نفرت تھی۔ اُس پر لعنت کے تیر برسائے جاتے تھے۔ اِس قفس کی تیلیاں توڑنے کے لئے بے تابی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یہی سبب تھا جو مجھے رازدار بنایا گیا۔ دل دے کر باتیں کی گئیں

محبت کے انداز اختیار کیئے گئے ۔ توقعات کی جوت جگائی گئی ۔ اب کہا جاتا ہے یہ سب کچھ اخلاقی قسم کا ایک کھیل تھا جس کے آخری حصّے سے رُوح کو تکلیف ہوتی ہے ۔ دل دُکھتا ہے اور جذبات کی توہین ہوتی ہے ۔ میں کہوں گا یہ محض پڑھی لکھی خاتون کا کھیل نہیں تھا جسے سطحی قرار دیا جا سکتا تھا ۔ یہ اُس بپھری ہوئی لڑکی کا کھیل تھا ۔ جو ایک مغرب زدہ فیشن پرست اور گریجویٹ ناکام بیوی کی حیثیت سے سامنے آئی تھی ۔ اور نہ صرف اپنے ماحول سے بلکہ خود اپنی ذات سے بغاوت کرنے پر تُلی ہوئی تھی ۔

واقعی میری بھُول تھی ورنہ آپ جیسے فکر و فہم کے آدمی سے یقیناً دُور رہتی اور انسانوں کا سا برتاؤ کرنے میں ضرورت سے زیادہ احتیاط کرتی ۔ شوہر سے تھوڑی بہت شکایت ہر عورت کو ہوتی ہے اور بیوی شکوہ و شکایت اور ناراضگی کا اظہار کرنے کی پُوری پُوری حقدار ہے لیکن اس باہمی اختلاف کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کی وفادار نہیں ہے ۔ میں بھی اپنے شوہر کے طرزِ عمل سے شاکی تھی ۔ ہُوں اور شاید رہُوں گی مگر اس کے دُکھ سُکھ کی شریک ہوں اور اس کے سوا کسی دُوسری طرف مُڑ کر بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی ۔ آپ کو کون بتائے کہ گریجویٹ لڑکی کے پہلو میں بھی دل اور دل میں آبرومند جذبہ ہوتا ہے اور وہ عام عورتوں سے زیادہ اپنے شوہر سے محبت اور شکایت کیا کرتی ہے ۔

کملا نے ٹیلیفون بند کر دیا ۔ اُس کے جسم میں کپکپاہٹ تھی ۔ آنکھوں میں ہلکے ہلکے آنسو ۔ ہونٹوں پر کچھ بوجھ سا ۔ آنکھیں بند کر کے بیٹھ جانا پڑا ۔ دل اور دماغ ۔ فکر اور نظر سب کچھ بیکار ہو چکے تھے ۔ کچھ دیر کے بعد اوسان ٹھکانے ہوئے اور اس نے جھُرجھُری سی لی ۔ تو اُس کے تصوّر میں سب سے پہلے وہی رنجیدہ نوجوان آیا جس کی محبت کا چراغ وہ پھُونک مار کر کبھی کا گُل کر چکی تھی ۔ چند لمحوں کے لئے وہ ساری باتیں بھُول گئی اور نیم وا انکھڑیوں کی

پرواز نے کالج کے راستوں میں لیجا کر کھڑا کر دیا۔ اُسے نوجوان کی محبت۔ مایوسی اور شکست فریاد کرتی ہوئی معلوم دی۔ اور اپنی خود پسندی دم توڑتی ہوئی نظر آئی۔ کملا کے ذہن میں گذشتہ واقعات ایک ایک کر کے تازہ ہو گئے۔ وہ پھر سہمی اور سہمنے کے ساتھ جبینِ ناز پر بل آ گیا نگاہیں زمین میں گڑ گئیں۔ کسی خاص ارادے نے ٹھوکے دینے شروع کئے اور وہ حساس کا سہارا لے کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔

کیلاش اپنے ہسپتال کے خاص کمرے میں بیٹھا ہوا پیچیدہ امراض والے مریضوں کے نسخوں پر غور کر رہا تھا۔ کہیں کہیں دوائیں گھٹا تا بڑھاتا بھی جاتا تھا۔ دفعتاً گھنٹے نے آٹھ بجائے اور کھٹ سے کوئی اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ کیلاش نے نگاہ اونچی کی تو سامنے کملا کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اُس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ کیلاش قدرے پریشان ہوا اُس نے بیوی کو اس رنگ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کملا نے بلا سوچے سمجھے سامنے رکھے ہوئے نسخوں کو اُٹھا کر چاک کر ڈالا۔ اور فاؤنٹین پن توڑ کر رکھ دیا۔ میز کی کتابیں اِدھر اُدھر پھینک دیں۔

کیلاش بُت بنا ہوا چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اسکی عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کملا کو کیا ہو گیا ہے۔؟

کملا نے دیوار پر لٹکے ہوئے انسانی جسم کے نقشے بھی نوچ دئے۔

کیلاش بدستور خاموش رہا۔

لیکن جب کملا دواؤں کی الماری کی طرف چلی تو کیلاش نے اُٹھکر اُس کا راستہ رُوک لیا۔

آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔؟

"ہر وقت کام۔ ہر وقت ہسپتال۔ نہ گھر کا ہوش نہ صحت کا خیال"۔ کملا کی آواز میں زور تھا۔

کیلاش کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ آ گئی۔!

پھر تو غصہ مجھ پر اُترنا چاہیئے۔ اِن بیچارے کاغذوں نے کیا بگاڑا ہے۔

جیسے کملا نے کچھ سُنا ہی نہیں۔!

سمجھیں۔؟

میں یہاں سمجھنے سمجھانے کے لئے نہیں آئی ہوں۔

پھر کس لئے آئی ہو۔؟

تمھیں گھر لیجانے کے لئے۔ جب دِل و دماغ کو سکون نہ ہو تو صرف روپیہ کمانے سے کیا حاصل؟

کیلاش کے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ کملا اسی طرح محبت سے پیش آئے۔

تم نے مجھ سے پہلے کبھی نہیں کہا۔؟

اب تو کہدیا ہے۔!

اِس اختیار اور انداز پر کیلاش کو پیار آگیا۔ اُس نے بے ساختہ کملا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور ہاتھ پکڑے پکڑے کار تک لایا۔ پہلے اُسے بٹھایا پھر آپ بیٹھ گیا۔

کہاں چلوں سرکار ــــ؟

"پلازا سینما" ــــ!

انگریزی نہیں کوئی ہندوستانی تصویر دیکھیں گے۔!

تم تو انگریزی فلمیں پسند کرتی تھیں۔؟

لیکن اب وہ اچھی نہیں لگتیں۔!

کملا نے کیلاش کے بازو پر آہستہ سے سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں +

طوفان سے بچنے کی کوشش ضرور کی جاتی ہے مگر رفتہ رفتہ ایک دَور ایسا بھی آتا ہے کہ جب نگاہ کشتی کی بجائے تھپیڑوں کی غارت گری پر رہتی ہے۔

میز پر کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ خاقان نے بد دلی سے ہیڈ کلرک کو طلب کیا اور بلا کسی سوال و جواب کے دستخط کر ڈالے۔ بھٹکے ہوئے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بظاہر دفتر میں موجود ہے مگر اس کا دل۔ دماغ اور نظر کسی نہ سلجھنے والی گتھی کو سلجھانے میں اس بُری طرح اُلجھ رہے ہیں کہ اُسے ماحول کا بھی ہوش نہیں رہا ہے۔

خاقان نے سگرٹ سُلگا کر دونوں پاؤں میز پر رکھ لئے اور کرسی کو ذرا پیچھے سرکا کر نگاہیں چھت میں لگے ہوئے بجلی کے پنکھے پر جما دیں۔ پنکھے کی بے پناہ گردش میں اُسے اپنی زندگی لرزتی ہوئی دکھائی دینے لگی اُس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اور چند آنسوں کے ساتھ جیب سے ایک خط نکال لیا۔ اس کا سر خود بخود کرسی پر ٹِک گیا۔

خاقان کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ٹھیک دو سال پہلے کا زندہ خاقان ہی جو زندگی کی طرف نگاہ کرنا بھی اپنی جوانی، اپنے عروج اور اپنے زمانے کی توہین سمجھتا تھا لیکن زندگی جس کا ہاتھ پکڑے پکڑے پھرا کرتی تھی۔ وہی محبت کے گیت گانے والی ندی ہی۔ وہی خاقان۔ اس کی چھوٹی سی کشتی۔ لہروں کا زور شور۔ بیچ منجھ دار۔ ہوا کی دل فریب اٹھیلیاں جن میں وہ اپنی کشتی لئے چلا جا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ پتواروں پر ہیں نگاہیں بہار آفریں رخسانہ پر حسین رخسانہ جس کے شگفتہ چہرے کے لمس سے صبا تر و تازگی اُڑانا چاہتی ہے شباب وشوق کے کفر بھرے سایہ میں کمال رعنائی کے ساتھ اُسکے سامنے بیٹھی ہے۔ محبت۔ حیات۔ مسرت اور بہار سبھی موجود ہیں۔ جینے کے لمحے ہیں مُسکرانے کا دَور۔ خاقان اِس شیفتگی سے کشتی کھے رہا ہے اور رخسانہ اس شان سے جلوہ فرما ہے کہ موجیں اُبھر اُبھر کر بہار سے چھینے ہوئے اس عالم کو دیکھ رہی ہیں۔

بہت دُور نکل آئے اب واپس چلنا چاہیئے۔ ؟

جی چاہتا ہے کشتی یوں ہی چلتی رہے اور تم میرے سامنے بیٹھی رہو۔ !

خاقان کی نگاہیں رخسانہ کے پاؤں چھُو رہی تھیں۔

تمھارے بازو تھک گئے ہوں گے۔ ؟

اس کی نظریں خاقان کے بازوؤں کو سہارا دینا چاہتی تھیں۔

سچ جانو رُخسانہ، جب تم میرے ساتھ ہوتی ہو تو مجھے قطعی تھکان نہیں ہوتی -!
رخسانہ نے ایک ایسی نظر ڈالی جس کا نشہ۔ رس اور گداز اس کے بازو پر زلفیں
بکھیر دینے کی قسم کھا رہا تھا۔

خاقان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا اور یاس والم کی یورش نے کمرے
میں ٹہلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ٹہلتا رہا اور دل کی بے تابی بڑھتی رہی۔ اچانک اس کی نظر
دوسرے منظر پر جا پڑی۔ اُس منظر پر جس نے اس کی زندگی کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا
اور جس کا تصور اسے گھنٹوں غمدیدہ۔ نمدیدہ اور رنجیدہ رکھتا تھا۔ خاقان کو یہ معلوم ہوا
جیسے رُخسانہ ہمیشہ کے لئے اُس سے علیحدہ کی جا رہی ہے۔ اس کی قابلیت۔ اخلاق اور
ہر دل عزیزی کا جنازہ نکل رہا ہے اور وہ ناکاروں سے بی، اے کے طالب علم کی حیثیت سے
اپنی بربادی کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے ماں باپ۔ بھائی۔ بہن
میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہے جسے دل کے زخم دکھا کر چارہ سازی کی درخواست
کی جائے۔ خاقان نے قریبی عزیزوں کا سہارا ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ خاندان
میں ویسے سب کوئی موجود تھے۔ مگر کسی نے بھی سر پر ہاتھ رکھنے کے لئے غور نہیں کیا اور
کِسے پڑی تھی کہ ایک بے زر۔ بے پر نوجوان کا ہاتھ پکڑنے کی ضرورت سمجھتا۔ صرف رُخسانہ
دمساز تھی وہ بھی اپنی جگہ مجبور۔ بے بس۔ بے زبان۔ گھُٹ گھُٹ کر رہ جانے، آنسو
بہانے اور نظر سے دلاسے دینے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ ایک پھوپھی باقی رہ جاتی ہیں
سوان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ مدت سے اس فکر میں میٹھی ہیں کہ بھائی
کا بچہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد نوکر ہو جائے تو اپنی لڑکی کا ٹھیک ٹھکانہ کر ڈالیں۔

خاقان نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ خط ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خاصی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد کچھ اوسان درست ہوئے اور سمجھ بوجھ ذرا کام آئی تو اُس نے آہستہ سے نمبر ملا کر اپنی کوٹھی پر ٹیلیفون کیا۔

نسیمہ:۔ دیکھو بھئی آج شام کو رُخسانہ آ رہی ہیں۔ رُخسانہ کا پیارا نام زبان پر آتے ہی خاقان کے دل میں مسرّت کی لہر دَوڑ گئی۔ غم و اندوہ اپنی جگہ صحیح سلامت۔ لیکن اس کی نگاہ میں تو رُخسانہ تھی وہ پری رُو۔ پری چہرہ۔ پری تمثال لڑکی جس کے سامنے وہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا تھا۔

کون رُخسانہ — ؟

ہاں رُخسانہ — خاقان بار بار نام لے کر جی جانا چاہتا تھا۔

اُن کے ساتھ اور بھی کوئی ہوگا — ؟

صرف اُن کے چھوٹے بھائی حامد میاں۔ !

تم کب آ رہے ہو۔ ؟

چھ بجے ادفس سے چھٹکارا ہوگا۔ اس کے بعد اسٹیشن جانا ہے۔ پہلی بار دلی آ رہی ہیں۔ دس بارہ برس کا بچّہ ساتھ ہے کوٹھی کا پتہ آسانی سے نہ مِل سکے گا۔

کل ڈاکٹر صاحب کے معائنہ کا کیا رہے گا — ؟

کوئی بات نہیں۔ پھر دیکھا جائے گا — ؟

ٹیلیفون بند کرنے کے بعد خاقان نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے دل میں پہلی بار جس خیال نے انگڑائی لی ہے وہ یہ تھا کہ "رُخسانہ آ رہی ہے" وہ تھوڑی دیر کے لئے افکار و آلام کی ساری کہانی بھول گیا۔ اور اسٹیشن جانے کی تیاری کرنے لگا۔

شب کو سول لائن کی اُس خاموش کوٹھی میں چہل پہل معلوم ہوئی جس کی بابت پڑوسیوں کو شبہ سا ہو چلا تھا کہ یہاں لوگ رہتے بھی ہیں یا نہیں ؟ خاقان کو اپنے گھر اور دفتر کے علاوہ کسی بات سے سروکار نہیں تھا۔ ایک سرکاری افسر۔ ؟ لیکن دوست احباب، کلب۔ ناچ گھر۔ علمی محفل۔ ادبی ہنگامے۔ سینما۔ تھیٹر۔ اور اس قسم کی ہر شے سے بیگانگی۔

سب نے ساتھ کھانا کھایا۔ ریڈیو بجتا رہا۔ اور کھانے کے دوران میں اِدھر اُدھر کی۔ خاندان کی۔ وطن کی باتیں ہوتی رہیں۔

بھائی صاحب یہاں کون کونسی تصویریں چل رہی ہیں۔ ؟ حامد نے اشتیاق کے ساتھ دریافت کیا۔

خاقان بولتا کا بولتا ہی رہا۔ نسیم بیچ میں بول پڑی۔

یہ کیا بتائیں گے۔ اخبار سے پتہ چلے گا۔ انھیں تو گھر اور دفتر کا راستہ معلوم ہے اور بس۔ شکر ہے آپ لوگوں کی آمد سے آج رونق ہو گئی ورنہ شام سے مُنہ لپیٹ کر ہی پڑ جاتے ہیں۔

نسیمہ کی بات میں طنز کا گہرا پہلو تھا۔

رُخسانہ کے دل پر چرکا سا لگا۔ خاقان چُپ تھا جیسے نہ یہ اُس کا تذکرہ ہے نہ وہ سُن رہا ہے۔ نسیمہ کھانے کی اُلٹ پلٹ میں لگ گئی۔ حامد بھولپن سے ہنسنے لگا۔

کھانا کھانے کے بعد ریڈیو بند کر دیا گیا اور ریکارڈ بجائے جانے لگے۔ فضا میں سوز و گداز تیرتا ہوا معلوم ہوا۔ تقریباً ایک درجن ریکارڈ بجائے گئے مگر کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس میں ٹوٹے ہوئے دل کی آواز۔ درد کی کسک۔ جنون کی خلش اور محبت کی شکست کا

اعلان نہ ہو۔ خاقان کو ایسا محسوس ہوا گویا یہ سب ریکارڈ آج ہی کے لئے جمع کئے گئے ہیں اور اس کے دل کی نمائندگی کی جا رہی ہے۔ جب اُس کا رونے۔ غم کھانے اور اپنی بیکسی پر ہنسنے کو جی چاہتا تو یہ ریکارڈ لے بیٹھتا تھا۔

رُخسانہ بیٹھی نہ رہ سکی۔ اور آنسوؤں کو چھپانے کے لئے پلنگ پر لیٹ گئی۔ مگر نرم نرم بچھونے میں بہت سے کانٹے چبھتے ہوئے معلوم دئے اور اُسے تمام رات کانٹوں کی سی چبھن میں گذارنی پڑی۔

صبح چائے پیتے وقت رخسانہ نے خاقان کے کمرے کو اپنی نگاہ سے دیکھا تو دیواروں پر اس قسم کی قلمی تصاویر نظر آئیں جن میں زندگی کو مختلف زاویوں سے تڑپتے روتے اور سسکتے دکھایا گیا تھا۔ پُورے کمرے میں سادگی ہی سادگی تھی اور اپنے مالک کی اُفتادِ طبع کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اُسے خاقان کی زندگی میں وہ چیخ۔ وہ ماتم۔ وہ فریاد رچی ہوئی ملی جس کی زبان نہیں ہوا کرتی۔

جب خاقان کی رُخسانہ دَولت۔ عیش۔ فرحت۔ نشاط اور نغموں کے درمیان جج صاحب کی رخسانہ بنا کر سُسرال بھیجدی گئی تو اس کے لئے دُنیا کی زیب و زینت۔ باغ و بہار اور پھول پھلواری میں کوئی دل کشی باقی نہیں رہی۔ اور اُس نے اپنے آپ کو اس شان سے بُھلا دیا کہ اُسے بھُول جانے والے بھی رہ رہ کر یاد کرنے لگے۔ خاقان خوبصورت تھا نوجوان تھا۔ خوش خصال تھا اور اس میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں جو اچھی شہرت رکھنے والے کسی نوجوان میں ہونی چاہئیں جس وقت اسے غمگساری کی ضرورت تھی اور وہ معمولی سی امداد کے لئے بوکھلایا پھر رہا تھا تو کسی کا دل پسیجنے کے لئے تیار نہیں ہوا

محض اس لئے کہ اُس وقت خاقان کے طرزِ حیات۔ طرزِ عمل اور طرزِ بیان میں کشش تھی وہ جینا چاہتا تھا اور زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ لیکن جب اس کے دل کا سکون۔ آنکھ کے آنسو اور منہ کے بول بھی ساتھ چھوڑ چکے۔ اور خزاں کی غارت گری سے دل برداشتہ ہو کر مایوسی۔ بے نیازی اور دیوانگی کے قریب پہنچ گیا تو اُسے قریب سے دیکھنے کے لئے لوگ بے تاب نظر آنے لگے۔ خاندان میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ رشتہ دار ایک دم چیخ اُٹھے۔ نہ جانے بے ماں باپ کے ہونہار بچّے کو کیا ہو گیا ہے۔ پھوپھی کا دل بھر آیا۔ مرحوم بھائی کی نشانی مٹّی میں ملی جا رہی تھی۔ دوست اپنی جگہ ہراساں ہو کر رہ گئے——— دُنیا سچ مچ دیوانوں کی بستی ہی تو ہے ورنہ انسانیت سے زیادہ دیوانگی۔ ہوشمندی سے زیادہ مدہوشی اور آدمی سے زیادہ حیوان کی قدر نہ کی جاتی۔ اور دیوانوں کا اس قدر خیال نہ رکھا جاتا۔

خاقان کو لوگوں کی رائے زنی۔ گفتگو اور چہ میگوئیوں کا بالکل خیال نہیں تھا۔ اُسے جس ہستی سے دل چسپی تھی وہ لوٹ کر واپس آ نہیں سکتی تھی اور وہ زندگی کا رُخ بدل نہیں سکتا تھا۔ پھر مُنہ سے بولنے اور سر سے کھیلنے کی نوبت کیوں آتی۔ اور خاقان اپنی طرف پلٹ کر دیکھنے کا احساس کیوں کرتا۔ وہ گراں جانی کے ساتھ دن گذارے چلا گیا۔ اور اُس کے لئے رونا اور ہنسنا دونوں وبالِ جان رہے۔

خاقان بہت ذہین۔ لائق اور فہیم نوجوان تھا۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر حالات کا تقاضا یہی تھا کہ امتحان میں شریک ہو جائے۔ خوشی سے یا بیزاری سے بہرکیف جینا اور زندگی کا بھرم رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ خاقان دنیاوی اعتبار سے صرف خاقان تھا۔ اور کوئی مددگار بھی ایسا نہ تھا جو اس کے بھلے بُرے میں کام آتا۔

کہتے ہیں فطرت ایسے ہی موقعوں پر کھل کھلا کر ہنسا کرتی ہے۔ وہی خاقان جو بی۔اے کے ناکارہ سے طالب علم کی حیثیت میں دیکھا گیا تھا۔ جسے زمانہ ایک غم دوست نوجوان سے زیادہ جاننا نہیں چاہتا تھا اپنے امتحان میں اعزاز کے ساتھ پاس ہی نہیں ہوا بلکہ اپنی لیاقت کی وجہ سے بہت جلد ایک اچھے عہدہ پر فائز بھی ہوگیا۔ اس تغیر سے عزیز و اقارب میں کھلبلی سی مچ گئی۔ خوشیوں اور دعاؤں کی ایک لہر تھی جو خالاؤں۔ پھوپھیوں، چچیوں اور ممانیوں کے دلوں میں دوڑ گئی تھی۔ سب نے اُسے مبارکباد دی اور اس کے ہاں آنے جانے کا سلسلہ جاری کر دیا۔ خاقان زمانے کا ستایا ہوا تھا۔ اپنوں کے تیور دیکھ چکا تھا لیکن اُس کی رگوں میں شریف خون تھا۔ رشتہ داروں سے انتقام لینا۔ بے رُخی سے پیش آنا یہ سب تیسرے درجہ کی باتیں تھیں وہ تو شکوہ شکایت بھی روا نہیں رکھتا تھا اسکے دل میں۔ زبان میں۔ عام سلوک میں نرمی تھی۔ اور وہ رشتہ داروں کی عزت و اعانت دونوں کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔

تقریباً سبھی کو توقع تھی کہ خاقان کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی ہوگی۔ لیکن وہ کھانے پہنے اور رہنے سہنے میں تھوڑی سی آسائش کے علاوہ پوری طرح جینے کے لئے تیار نظر نہیں آیا۔ کچھ عرصے تک تو خاموشی رہی۔ لیکن ایک برسرِ اقتدار نوجوان کو کب تک نظر انداز کیا جاتا لوگوں کی زبان پر شادی کے چرچے کھیلنے لگے۔ خاقان کو کتنے ہی آدمیوں نے چھیڑا اور وہ ٹال ٹال گیا۔ مگر پھوپھی سے دامن چھڑانا اُس جیسے شریف آدمی کا کام نہیں تھا۔ انھوں نے مرنے والے بھائی کا واسطہ دیا۔ خاندان کا نام چلانے کی اپیل کی اور اُسوقت تک ہاتھ پکڑ کر چھوڑنے کا نام نہیں لیا جب تک خاقان نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ہاں نہ کرلی۔ نتیجہ کے طور پر آہوں اور دھڑکنوں کا ساتھ دینے کے لئے پھوپھی جان کی لڑکی

نسیمہ اُس کی شریکِ حیات بنادی گئی۔

خاقان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ اس نے نسیمہ کے سامنے پیش کردیا۔ پوری تنخواہ بیوی کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ سیاہ سفید کا اختیار تھا۔ مگر سب کچھ دینے کے باوجود وہ دل نہیں دے سکا۔ دراصل مجبور بھی تھا۔ دل کہاں سے لاتا وہ تو کبھی کا مرچکا تھا۔

نسیمہ خوبصورت سمجھ دار لڑکی تھی۔ تعلیم بھی اچھی پائی تھی تربیت بھی اچھی ملی تھی۔ اُس نے دُنیا ہاتھ میں لے کر شوہر کا دل بھی مٹھی میں لینا چاہا۔ لیکن وہ ناکام رہی نسیمہ چاہتی تھی کہ شوہر کے چہرے پر تازگی۔ ہونٹوں پر تبسم اور نگاہوں میں محبت کھیلا کرے۔ خاقان چاہتا تھا کہ نسیمہ صرف روپے سے کھیلتی رہے اور اُسے پانے کی تگ ودو نہ کرے۔ احساس واعتماد کی اس کش مکش نے دونوں میں خلفشار سی پیدا کردی۔ نسیمہ نے اس زیادتی پر پہلے خاموشی سے احتجاج کیا۔ پر وہاں خاموشی کا سا عالم پایا گیا۔ اُسے مجبوراً ماں کا دامن پکڑنا پڑا۔ بیگانگی کی شکایت کی جانے لگی پھوپھی نے فضا کو آہستگی سے سازگار کرنا چاہا۔ بھتیجے کے دل کو ٹٹولا۔ مگر خاقان کا کیا قصور تھا۔ وہ چار پیسے بھی بیوی سے مانگ کر لیتا تھا۔ کچھ دنوں کے لئے بات آئی گئی ہوئی۔ خاقان کے لئے غم نئی چیز نہیں تھا وہ تو اسی کے سہارے جی رہا تھا۔ لیکن نسیمہ کے دل کو جو گھُن لگا وہ اس کے چہرے سے پھُوٹے بغیر نہیں رہا۔ اِس چیز نے ماں اور رشتے داروں کو ہولا دیا۔ اور خاقان کے خلاف نکتہ چینی کی جانے لگی۔ اُسے بھی تھوڑی بہت پریشانی سے دوچار ہونا پڑا۔ بدمزگی کا دَور دورہ تو تھا ہی۔ کبھی کبھی ہلکی پھُلکی جھڑپ بھی ہوجاتی تھی۔

ہرچند کہ خاقان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ تاہم اُس کی خاموشی اتنی شورش بھی برداشت نہ کرسکی اور اس لئے کوشش کرکے اپنی سروس صوبائی حکومت سے مرکزی

حکومت میں تبدیل کرالی اور اس خیال سے دلّی چلا آیا۔ کہ پردیس میں رہ کر نہ صرف رشتہ داروں کی سخت و سُست سے چُھٹکارا ملے گا بلکہ نسیمہ کا جی بھی بہل جائے گا۔ لیکن دل کے زخم آب وہوا سے اچھے ہوا کرتے تو شاید اُسے بھی چین مل جاتا۔ پہلے نسیمہ دو چار دن کے لئے میکے جاکر غم غلط کرآتی تھی لیکن اب دل کی آگ دل ہی میں سلگ رہی تھی اور گاہے گاہے خطوط کے ذریعہ موجودہ صورتِ حال سے ماں کو اطلاع دی جا رہی تھی۔

دلّی سے جو بدمزگی کی اطلاعات میکے پہنچیں تو خاقان کے رویہ پر کُس کر اعتراض کھلکر ملامت کی گئی۔ اور اب کے اس طرح طوفان برپا کیا گیا کہ خاندان کا شاید ہی کوئی گھر باقی بچا ہو جس میں خاقان اور نسیمہ کے عنوان پر کسی نہ کسی لہجہ میں بحث نہ کی گئی ہو۔ شدہ شدہ یہ خبریں رخسانہ کے کانوں میں بھی پڑیں اور وہ ناز و نزاکت کی پُتلی بھی ایکدم سناٹے میں آگئی۔

رخسانہ نے خاقان کو دل و جان سے چاہا تھا اور سچ مچ اس والہانہ انداز سے پرستش کی تھی کہ اگر خاقان سَو بار جی کر ہر بار اپنے آپ کو اُس پر سے نچھاور کر دیتا تو بھی اُس دلنوازی کی قیمت ادا نہ ہوتی جو رخسانہ اُس کے لئے روا رکھتی تھی۔ اُس نے خاقان پر نگاہیں ڈالی تھیں۔ اُس کے وجود پر عکس ڈالا تھا اور دل میں دل ڈال کر اُسے بیچارگی کی گہری پستیوں سے اُبھار لائی تھی۔ یہ رخسانہ ہی کی اداؤں کا بانکپن۔ نگاہوں کا سرور اور محبت کے شگوفے تھے جو خاقان کے چہرے پر رنگ و نُور بن کر کھلے اور وہ پسنے۔ مٹنے اور لُٹنے کے باوجود تصور کے سہارے اُسی شاہراہ پر کھڑا رہا جہاں وہ اور رخسانہ کبھی بانہوں میں بانہیں ڈالے پھرا کرتے تھے ——— رُخسانہ ہی جانتی تھی۔ کہ خاقان سے علیحدہ ہوتے وقت اُس کے دل پر کیا گذری تھی۔ وہ لرز رہی تھی۔ کانپ رہی تھی۔ جسم بخار کے مارے پُھکا جاتا تھا۔ ہوش و خرد جواب دئے دیتے تھے۔ وہ نو عمر لڑکی تھی اور اُسے معلوم نہیں

تھا کہ زندگی میں ایسے بھی انقلاب آتے ہیں۔ کہ ذراسی دیر میں ادھر کی دنیا اُدھر بدلجاتی ہے۔
شادی کے بعد دولت۔ دنیا اور عروج پاکر بھی رُخسانہ خاقان کو نہ بھُول سکی۔
اُٹھتے بیٹھتے اُس کے سامنے ایک سایہ سا جھلملاتا رہتا۔ وہ مغموم رہا کرتی۔ دل میں محبّت
کا طوفان تھا۔ آنکھوں میں نیند کی بجائے آنسوؤں کے ڈورے۔ اُس کے دن رات
خاقان کے خیال میں بسر ہوتے۔ شب کی آہیں بھی تھیں۔ رات کے نالے بھی تھے۔ مگر
رخسانہ عورت تھی اُس کی زبان پر رسم ورواج نے مُہر لگا کر بولنے چیخنے اور فریاد کرنے کی
طاقت سلب کرلی تھی اور رخسانہ عشق اور مشک دونوں کو چھپانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔
خاقان کی بیگانگی اور گھر ملو کشیدگی کا سبب رخسانہ خوب جانتی تھی۔ اس کے
سوا اور جان بھی کون سکتا تھا۔ وہ آبدیدہ ہوگئی۔ غم نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اُس
نگاہ میں خاقان کا اُداس مجسّمہ تھا۔ رُخسانہ سہم گئی۔ اُس کے دل میں دبے ہوئے شعلے
اتنی شدّت سے بھڑکے کہ اُن کی جلن دماغ اور رُوح تک پہنچ گئی۔
رُخسانہ کئی دن تک اسی کشمکش و پیچ میں رہی۔ کہ خاقان کو سنبھالنے اور سہارا
دینے کے لئے کیا روش اختیار کی جائے۔ اُس کی راہ میں بہت سی دیواریں تھیں بہت سی
کانٹوں کی جھاڑیاں۔ اور سب کی سب اُس کا راستہ روکنے کے لئے کھڑی تھیں۔ مگر رخسانہ
اب حد سے گذر جانے کو بھی تیار تھی۔ خاقان کو اس عالم میں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں
تھی۔ اُس کے سامنے مذہب۔ ماحول۔ اخلاق اور محبّت سبھی موجود تھے۔ اور اس کا دفار
کسی سے بھی رُوگردانی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ سوچتی رہی۔ خیال کروٹیں بدلتا رہا۔
محبّت چُٹکیاں لیتی رہی۔ یکایک رُخسانہ کی آنکھوں میں خاص طرح کی چمک پیدا ہوئی
اور وہ فولادی عزم کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ مہمان بن کر خود دِلّی

جائے گی اور خاقان کی زندگی کا انداز بدل کر دم لے گی۔ رُخسانہ اِس شان۔اس ارادے اوراس امتیاز کے ساتھ خاقان کے جنگل میں منگل بن کر آئی تھی۔

رُخسانہ ابھی خاقان کے کمرے میں آئی تھی اور ایک کتاب اُٹھا کر چند ورق اُلٹنے ہی پائی تھی کہ خاقان اندر داخل ہوا۔ رُخسانہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

اُس نے خاقان پر نگاہیں ڈالیں۔خاقان نے حیرانی کے عالم میں اُسے دیکھا نظریں دونوں وقتوں کی طرح ملیں اور دبی ہوئی چوٹیں سی اُبھار گئیں۔

بڑا کرم فرمایا رُخسانہ ؟ خاقان نے ایک ہلکی سی آہ بھر کر کہا۔

رُخسانہ بولنا چاہتی تھی مگر آواز حلق میں گھُٹ کر رہ گئی ——!

تشریف رکھیئے ——؟

جی ——!

دونوں کی آواز میں لرزش تھی۔

کیسا مزاج ہے۔ ؟

اچھا ہے ——؟

ریحانہ اچھی ہے ——؟

جی ——!

ہمیں تو اب بھُول گئی ہو گی۔خاقان نے محبت کی ایک ہری شاخ کو چھوا۔

رُخسانہ تڑپ گئی۔اُس کے دل کے تار اندر ہی اندر بجنے لگے۔!

زمانہ بھُول چکا وہ تو ننھی سی بچی ہے —؟ خاقان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ

آنسو گرنے لگے۔

کیا کہہ رہے ہو——————؟ رُخسانہ سے ضبط نہ ہو سکا۔

ریحانہ۔ حامد۔ باغ کا بوڑھا مالی۔ کشتیوں کا نگہبان۔ سب تمھیں یاد کرتے ہیں لیکن...... وہ میرے سامنے چُپ رہتے ہیں۔ اُنھیں میری موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تمھارا نام۔ تمھاری باتیں سُن کر میں دیوانی سی ہو جاتی ہوں۔

رُخسانہ آبدیدہ ہو گئی۔

خاقان نے اُسے کبھی رونے نہیں دیا تھا۔ اُس نے بے تاب ہو کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

مَیں تمھیں رونے نہیں دوں گا۔؟

رُخسانہ کے آنسو جاری رہے۔!

میرا دم نکل جائے گا۔ رُخسانہ۔؟

تم کیوں رو رہے ہو۔؟

میرا کیا ہے——————؟ یاس والم کے بوجھ سے خاقان کی گردن جُھک گئی۔

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ دونوں روتے رہے۔ اُن کی زبانیں چُپ تھیں اور نیچی نگاہیں پکار پکار کر دل کی دھڑکنوں کا اعلان کر رہی تھیں۔

رونے تڑپنے اور آنسو بہانے کے بعد ذرا دل میں ٹھنڈک پڑی تو رُخسانہ نے آہستہ سے پُوچھا۔

یہ کیا حال بنایا ہے۔؟

کون جانے ——— ؟ خاقان کے پاس مایوسی کے سوا اور رہ بھی کیا گیا تھا۔

اِس خود فراموشی سے کیا حاصِل ——— ؟ رُخسانہ کے لب و لہجہ میں ہمدردی تھی۔

سچ پوچھتی ہو رُخسانہ ——— ہر وقت یہ معلوم ہوتا ہے جیسے تم میرے پاس کھڑی ہو۔ وہی باغ ہے۔ وہی ندی کا کنارا۔ تم میرے سامنے بیٹھی ہو۔ اور میں اُٹھتی ہوئی لہروں اور ننھی ننھی بوندیوں میں اپنی چھوٹی سی کشتی بڑھائے لئے جارہا ہوں۔ وہ عالم بھولتا ہی نہیں۔ خود فراموشی بھی اُسے نہ بھلا سکی۔ جیسے کوئی میٹھے میٹھے سنہرے خوابوں میں جھول رہا ہے۔

رُخسانہ کی آنکھیں شکریہ کے طور پر جھکیں اور فرش پر موتی بکھیرنے لگیں۔!

یُوں زندگی کیسے گذرے گی۔ ؟

زندگی کا کیا ہے رُخسانہ، گذر رہی ہے اور گذر جائے گی۔ !

طبیعت سنبھالو۔ ؟

بخدا بہت سنبھالنا چاہا۔ مگر وہ محبت کے رات دِن آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتے۔ !

اُن کی طرف نہ دیکھو۔ ؟

تمھیں کِس دل سے بھُول جاؤں۔ ؟

کوشِش کرو۔ ؟ رُخسانہ دل پر پتھر رکھ رہی تھی۔

تم بھُلا دینے کی چیز ہو ——— ؟؟؟ خاقان نے رُخسانہ کو اِس طرح دیکھا جیسے سچ مچ اس کی بلائیں لے لیگا۔

پھر اس کا جی بھر آیا اور وہ بے چینی کے ساتھ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

رُخسانہ سے بھی بیٹھا نہ رہا جا سکا۔

خاقان۔۔ ——؟

لیکن اُس کی نظر سامنے والے درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر جمی ہوئی تھی۔

بُرا مان گئے۔ ۔؟

خاقان نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ ؟

مجھ سے تمہارا دُکھ نہیں دیکھا جاتا۔ !

سُکھ اپنے اختیار میں تو نہیں ہے۔ ؟

دل پر تو اختیار ہو سکتا ہے۔ ؟

وہ تو کبھی کا اختیار سے باہر ہو چکا۔ ؟

ہر وقت گم سُم رہنا اچھا معلوم ہوتا ہے ؟

آج کل اِسی میں سکون ملتا ہے ؟

مَیں کہتی ہوں تمھیں ہوش میں آنا پڑے گا۔ ؟

خاقان کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ نیچے سے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور وہ آنسو پونچھتا ہوا نیچے اُتر گیا۔

نسیمہ صحن میں بیٹھی ہوئی کپڑے سنبھال رہی تھی۔ خاقان ہول سا گیا۔ اور اس نے چور کی سی خوشامد کے ساتھ کہا۔

پھوپھی جان کو بھی خط لکھ کر بلا لو۔ ؟

نسیمہ کے سُوکھے دھانوں میں پانی سا پڑ گیا۔ اور وہ سوچنے لگی کہ آج خاقان خوش خوش کیوں ہے۔؟

کِس کا ٹیلیفون تھا۔؟

دفتر کا۔!

اماں جان کو کیوں بُلا رہے ہو۔؟

سیر تفریح کے لئے۔ اپنے عزیز کیا آیا نہیں کرتے۔؟

نسیمہ کا دل لاکھوں من کا ہو گیا۔

خاقان کے دل میں بھی نیا سرور۔ نئی اُمید۔ نیا چاند طلُوع ہونے لگا۔

غم اور مایوسی نے مل جُل کر خاقان کی زندگی پر جو چھاونی سی چھا دی تھی اُس نے کبھی ہونٹوں پر ہنسی آنے نہیں دی تھی اور اونچی دُنیا کا افتخار بھی مُسکرانے پر مجبُور نہیں کر سکا تھا۔ لیکن جس ماہ پارہ کی جُدائی نے مرنے جینے سے ورے پرے کا یہ عالم پیدا کیا تھا اور خوشنما چہرہ پر مایوسی کی لڑیاں بکھیر کر شگفتگی۔ تازگی اور شادابی چھین لی تھی۔ اُس کی موجودگی چمن چمن سے بہار اُڑا لائی تھی اور خاقان کے دامن کو اس شان سے دامنِ بہار بنایا تھا کہ وہ اپنی دُنیا کو سراپا بہار بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ خاقان کے رنج والم رُخصت سے ہو چکے تھے اُس کے سامنے ایک ہی عنوان تھا" رخسانہ یہاں موجود ہے"۔ اب جہاں رخسانہ پھرتی تھی وہیں خاقان کی نگاہیں پھرتی تھیں۔ محبت بھی نازفرما تھی جنوں بھی کارفرما۔ خاص انداز سے شرمانے۔ من بھرنے اور ہوش اُڑانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کوثر میں بھیگی ہوئی راتیں بھی تھیں جنت سے چُرائی ہوئی باتیں

بھی۔ خاقان نے ایک زمانے میں اُمیدوں کے بہت سے خاکے بنائے تھے نقشے ترتیب دیئے تھے۔ پر دُنیا کے تغیر نے اُن میں رنگ بھرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ لیکن اب وہ ماضی کے دُھندلکوں میں سے اپنی تمام چیزیں نکال لایا تھا اور زمانے کے گرد و غبار کو اپنی پلکوں سے صاف کر دینا چاہتا تھا۔

پہلے دو دن رخسانہ پر حسرت چھائی رہی اور اُسے کُڑھنے کلپنے اور غم کھانے کے سوا بہت کم کسی چیز کا ہوش تھا۔ خاقان کو فکر مند دیکھ کر فکر مند گریاں پاکر گریاں ہو جاتی تھی اور اُسے اپنا مشن یاد رہا تھا اور وہ اسی کے مُطابق آگے بڑھتی رہی تھی لیکن جب خاقان کی خزاں بہار کے قدموں میں گر پڑی اور وہ افسردگی کو سرشاری سے بدل کر محبّت بھری نگاہ کے ساتھ سامنے آگیا۔ تو وہ حسین مورتی بھی اپنے پاؤں۔ اپنی زنجیر اور اپنے آپ کو نظر انداز کر کے اُس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اپنا مقصد بھی یاد نہیں رہا۔ اور وہ یاد رکھتی بھی کیوں ؟ وہ تو اپنے خاقان کے برابر کھڑی تھی اور خاقان کوئی غیر نہیں تھا۔ سگی خالہ کا لڑکا۔ وہی دُکھ سُکھ کا ساتھی جس کے ساتھ لڑکپن کی گلیوں۔ جوانی کی شاہراہوں اور محبّت کی روشوں پر ٹہلا کرتی تھی۔ برسوں اس کی پوجا کی تھی۔ دِل سے پیار کیا تھا اور سب سے بے پروا ہو کر اس کی پروا کی تھی۔ وہ کس دل سے خاقان کا دل توڑ سکتی تھی۔

ایک ہفتے تک شہر۔ سینما۔ باغات۔ کشتی۔ تاریخی اور مذہبی عمارتوں کی سیر ہوتی رہی اور ان کے تقدس نفاست اور عروج کو اپنی محبّت کا گواہ بنایا جاتا رہا۔ خوب خوب تفریح ہوئی۔ گھُومے چلے پھرے اور تھکے۔ لیکن نہ رخسانہ کو واقعات کی نزاکت کا احساس ہوا نہ خاقان نے اپنی دوہری ذمہ داریاں محسُوس کیں۔

ایک دن سہ پہر کو خاقان پھلوں کی قسم کا کچھ سامان لے کر آیا تو نسیمہ نے ٹوکری ہاتھ سے لے کر بتایا کہ رُخسانہ بہن کل صبح جا رہی ہیں۔ خاقان دہم رہ گیا۔ نسیمہ کمرے میں چلی گئی اور خاقان اُوپر چلا گیا۔

رُخسانہ کرسی پر بیٹھی تھی۔

خاقان اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

نہ وہ کچھ بول سکی نہ کچھ اس کی زبان سے نکل سکا۔

لیکن جب رُخسانہ کی لمبی لمبی پلکوں نے رخساروں کو چھُوا۔ اور آنسوؤں کے چند قطرے ڈھلکے تو خاقان بوکھلا سا گیا۔

ایسی کیا جلدی ہے کچھ دن تو اور رہو۔ ؟

میرا بس ہوتا تو............!

نہ جانے تمہارے جانے کے بعد میرا کیا حال ہوگا۔ ؟

رُخسانہ رونے لگی ۔ ؟

خدا کے لئے رخسانہ رؤ نہیں میں بالکل دیوانہ ہو جاؤں گا۔ خاقان نے ذہنی گھُٹن کے ساتھ کہا۔

بہت اچھا اب نہیں روں گی۔ رُخسانہ ڈر گئی اور آنسو دوپٹے کے آنچل میں چھُپا لئے۔

تھوڑی دیر کے لئے دونوں چُپ ہو گئے۔!

نسیمہ نے نیچے سے چائے کے لئے آواز دے دی۔

خاقان اور رخسانہ جو چند گھنٹے پہلے ہشاش بشاش تھے اور صدمے کا ہلکا سا

تخیل بھی اُن کے دِل و دماغ سے دُور تھا اب پھر کھوئے کھوئے سے ہو گئے تھے! اور ان کے چہروں سے پریشانی ٹپکے پڑ رہی تھی۔ خاقان کی وحشت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ رات ہوتے ہوتے وہ اپنے سہارے کھڑا بھی رہ سکے گا یا نہیں؟

رخسانہ کو چُپ سی لگ گئی تھی اور وہ کسی گہرے سوچ میں دکھائی دیتی تھی۔

رات بھیگ چکی تھی مگر آج نہ ریڈیو بجا نہ باتیں ہوئیں۔ کہانیاں کہی گئیں نہ پہیلیاں بوجھی گئیں۔ حامد پلنگ پر لیٹتے ہی سو گیا۔ نسیمہ صبح مہمانوں کے ساتھ کھانا بھیجنے کے انتظام میں کافی تھک چکی تھی۔ اُس نے بھی اِس طرف توجہ نہیں دی اور جلدی سی سو گئی ہاں رخسانہ کی انکھڑیوں میں خُمار تھا نہ خاقان کی آنکھوں میں نیند۔ دونوں اپنی اپنی جگہ تڑپ رہے تھے۔

سو گئے ——؟

نہیں تو —— خاقان اُٹھ بیٹھا۔

خلافِ معمول رخسانہ کے چہرے پر پھیکی پھیکی سی مُسکراہٹ تھی۔!

تم چاہتے ہو میں یہاں سے ہنستی ہوئی جاؤں۔ ؟ رخسانہ نے چہرہ کو ذرا اور متبسم فرما کر سوال کیا۔ ؟

کیوں نہیں۔ ؟ خاقان نے حیرانی اور سرشاری کے ساتھ جواب دیا۔

تو پھر مجھے ایک چیز دے دو۔ ؟

جو چاہو حاضر ہے۔ ؟

اپنا غم میرے سپرد کر دو۔ میں اسے ساتھ لے جاؤں گی۔ اپنے پاس ہرگز نہیں رکھوں گی بلکہ اُن نظاروں کو تقسیم کر دوں گی جن کی یاد تمھارے دل سے محو

نہیں ہوتی۔

خاقان بے چین ہوگیا۔ اُس کے دل میں ایک ایسی چیخ بلند ہوئی جس کی آواز صرف اُس کی رُوح سُن سکتی تھی۔

خاقان ——— ؟ ہم نے ایک دوسرے کو رسم و رواج سے بلند ہو کر چاہا ہے بے پناہ اور بے لوث محبت کی ہے۔ ہمارے سامنے دنیا کا نہیں تھا۔ دولت کا نہیں تھا دلوں کا سوال تھا۔ خدا جانتا ہے کہ محبت۔ اخلاق اور مذہب کے تقاضوں کو ہم نے کس قدر خوش اسلوبی سے پورا کیا ہے۔ لیکن سماج کہتا ہے کہ ہم سے پوچھ کر محبت کی جانی چاہیئے تھی۔ شاید یہی فرو گذاشت تھی جس کی سزا کے طور پر ہمیشہ کے لیئے ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ لیکن ہم آپس میں سچی محبت کرتے تھے۔ ہمارے دل ایک۔ افکار ایک۔ روحیں ایک ہیں ہم بدستور محبت کرتے رہیں گے لیکن شورش دیوانگی اور وحشت کے ساتھ نہیں۔ کیف و نشاط کے ساتھ ——— تم مرد ہو خاقان تمہارے اختیارات وسیع۔ ذرائع وسیع اور دلچسپیاں وسیع ہیں۔ ہر بات کو برداشت کر سکتے ہو۔ لیکن میں عورت ہوں بہت سی مجبوریوں۔ لاچاریوں۔ ناکامیوں کا مجسمہ۔ میرے لئے ہنسنا آسان ہے نہ رونا۔ دل دیوانہ ہو سکتا ہے مگر آنکھوں سے آنسو نہیں گر سکتے۔ تم ہی بتاؤ جس وقت تمہاری بے پروائی کی اطلاعات وطن پہنچتی ہیں اور تمہاری سُسرال میں اُن پر تنقید کی جاتی ہے۔ الزام لگائے جاتے ہیں اور لعنت بھیجی جاتی ہے اُس وقت میرا کیا حال ہوتا ہوگا۔ سب کچھ سُنتی ہوں لیکن اُف نہیں کر سکتی۔ لوگ کیا جانیں خاقان کیا ہے اور کیوں زندگی سے بیزار ہے۔ رُخسانہ رونے لگی۔

کیا کروں۔ تمہارے سوا کسی دوسری طرف دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ؟

پھر تم نے شادی کیوں کی تھی ــــــــ ؟ رخسانہ نے تیکھی نظروں سے خاقان کو دیکھا اور خوبصورت پیشانی پر بَل پڑ گیا۔

محض پھوپھی جان کی ضد پوری کرنے کے لئے ۔ ؟

اُن ہی کے لئے نبھاؤ ۔ اور اگر ان کے لئے نہیں تو اب میرے لئے نبھانا پڑیگا۔

رخسانہ کی آواز میں حکم کا انداز تھا۔

خاقان ششدر رہ گیا ۔

جانتے ہو مَیں یہاں کیوں آئی تھی ۔ تم سے درخواست کرنے کے لئے ۔ خدا کے واسطے محبت کو زندگی کا رہنما بناؤ جنوں کے اشاروں پر چلانے کی کوشش نہ کرو۔ اگر اب بھی تم نہیں سنو گے تو آئندہ تمھاری دیوانگی دنیا میں رہیگی لیکن میں نہیں رہوں گی۔

رُخسانہ پھر رونے لگی۔

خاقان کا دل ہِل گیا۔ رخسانہ مَیں تمھارے لئے سب کچھ چھوڑ دوں گا ۔

سچ ۔ رخسانہ خوشی اور محبت کی نظر ڈال کر بولی ۔

بالکل سچ ــــــ !

دُلہن کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا ۔ ؟

بیشک ــــــ !

خاقان اب میں کبھی غمگین نہیں ہونگی ۔ تم نے سچ مچ میرا دل مسرت سے لبریز کر دیا ہے۔

مَیں اپنے لئے نہیں اپنی رخسانہ کے لئے زندہ رہوں گا ۔

دونوں رات کو سوئے تو چہروں پر ملال کی لہریں تھیں نہ دِلوں پر غم کا بوجھ۔

بلکہ ایک قسم کی خوشی تھی ایک طرح کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے فطری محبت کا وہ شاہکار پیش کیا تھا جس کی بلندی پر محبت کو بھی فخر ہو سکتا تھا۔ سماج انھیں شکست نہیں دے سکا۔ انھوں نے سماج کو شکست دی تھی۔

صبح چلتے وقت ایسی چہل پہل اور گہما گہمی تھی جیسے سچ مچ کسی نئی دلہن کو بنا سجا کر میکے بھیجا جا رہا ہو۔ خاقان۔ نسیمہ۔ نوکر چاکر اور خادمائیں اسٹیشن جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ سفر کے لئے کھانے کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا۔ بستر بندھ رہے تھے ٹرنک بند کئے جا رہے تھے۔ اور ہر کام شوق سے انجام پا رہا تھا۔ سب ساتھ روانہ ہوئے سیٹیں پہلے ہی ریزرو کرائی جا چکی تھیں۔

گاڑی چھوٹنے میں چند منٹ باقی تھے۔ رُخسانہ نے محبت اور شکریہ کی پھولوں بھری نگاہ سے خاقان کو دیکھا۔ اور اقتدار کی گہری جھلک کے ساتھ نسیمہ اور خاقان کے ہاتھ پکڑ کر بالکل اسی طرح ملا دئے جیسے محبت دِل ملا دیا کرتی ہے۔ خاقان نے نئی زندگی محسوس کی۔ نسیمہ اَچنبھے اور انبساط کے لطیف امتزاج کے ساتھ باغ باغ ہوگئی۔

دُلہن کا ہاتھ یوں ہی پکڑے رہو گے — ؟

بہت خوب — ! خاقان نے قدرے سر جُھکا کر عزت۔ آہستگی اور ادب سے یہ دو لفظ اِس طرح ادا کئے۔ جس طرح کوئی خادم اپنی مالکہ کے سامنے تعمیلِ حکم کا صدق دلی سے اقرار کرتا ہے۔

رُخسانہ کو ساتھ خیر سے رُخصت کرنے کے بعد دونوں میاں بیوی گھر آگئے۔ نسیمہ

اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لیکن حسب عادت خاقان اپنے کمرے میں داخل ہونے لگا تو خود بخود اس کے قدم ڈگمگا گئے اور رخسانہ کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ اُلٹے پاؤں لَوٹ کر نسیمہ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی نگاہ سو اپنے میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ خاقان نے آئینہ پر نگاہ ڈالی تو اُسے نسیمہ کے عکس میں رُخسانہ مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ نسیمہ شوہر کو دیکھ کر پلٹی اور خاقان نے جذبات کی بلندی کے ساتھ ایک نہیں اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ دوسرے لمحے میں نسیمہ کے ھاتھ خاقان کے سینے پر تھے اور خاقان کے ہاتھ نسیمہ کے گلے میں۔

خاقان دفتر جا چکا تھا۔ اور نسیمہ عقل میں نہ آنے والی جادو کی سی ان باتوں میں غلطاں پیچاں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ سوچ چلی جاتی تھی لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ رخسانہ کی زبان میں کہاں کا سحر تھا جس نے خاقان کو ایک منٹ میں بدلکر رکھدیا۔ پھر وہ اختیار۔ وہ وقار۔ وہ حکم کا انداز خاقان کی نظر۔ دل اور رُوح کا جُھک جانا نسیمہ کے سامنے خاقان اور رخسانہ کبھی سوال بن کر نہیں آئے تھے۔ اس لئے کہ وہ خاقان کی غریبی اور رُخسانہ کے گھر کا عروج بھی دیکھ چکی تھی اور قریبی عزیزداری کے باوجُود دونوں کی جُدا جُدا راہیں بھی دیکھ چکی تھی۔ اُن کے متعلق اس نے کبھی کچھ نہیں سُنا تھا اور پورے دس روز اپنے گھر میں رکھنے پر بھی انھیں تہذیب۔ شرافت اور سنجیدگی کے سوا کچھ نہیں پایا تھا۔ یہ حقیقتیں نسیمہ کو اور بھی حیران کئے دیتی تھیں۔ مگر اس حیرانی کے ساتھ ساتھ وہ رخسانہ کے لئے اپنے دل میں جگہ پاتی تھی۔ یہ رُخسانہ ہی تھی جس نے اُسے زندگی کی آسودگیوں سے ہمکنار کیا تھا اور اس کے محبُوب شوہر کو واپس دیکر دل کی کلیاں سی کھلا گئی تھی۔

نسیمہ خیالات کی شورش سے اُکتا گئی اور خاقان سے ٹیلیفون پر باتیں کرنے کی غرض سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کمرے میں پہنچکر رسیور اُٹھانا چاہتی تھی کہ میز پر نوٹ بُک کے نیچے ایک لفافہ نظر آیا۔ غالباً خاقان کوٹ تبدیل کرنے کے بعد نوٹ بُک کے ساتھ اِسے بھی بھول گیا تھا۔ نسیمہ نے اُٹھا کر دیکھا تو کسی عورت کی تحریر معلوم ہوتی تھی وہ بے محابا پرچہ نکال کر پڑھنے لگی۔

نسیمہ پڑھتی گئی اور اُس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر کئی رنگ پیدا ہوتے رہے۔ یہ رخسانہ کا خط تھا جو اُس نے اپنے آنے کی اطلاع کے طور پر ارسال کیا تھا۔ نسیمہ نے پھر خط پڑھا۔ رُخسانہ نے لکھا تھا:۔

خاقان ——— قدرت کو یہی منظور تھا کہ دِلی تعلق کے باوجود ہمیں آپس میں نہ ملنے دیا جائے۔ لیکن ہماری محبّت بلند رہی ہے۔ ہم بلند رہے ہیں اور اتنی دوری پر بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں تمھیں دیکھنے کے لئے جی لوٹتا تھا پر تم نے وطن چھوڑ ہی دیا۔ یہاں بہت سی قیدیں لگی ہوئی تھیں ہر چند کہ اب بھی وہی مجبُوریاں ہیں لیکن تم سے کچھ ضروری باتیں کہنی ہیں اور مَیں ۷ ارکو صبح کی ٹرین سے آرہی ہوں۔ چند روز قیام رہیگا۔ میرے ساتھ صرف حامد میاں ہونگے۔ تمھاری ریحانہ ابھی تک تمھیں یاد کرتی ہے۔ دُلہن کو میری طرف سے بہت بہت سلام۔ بہت سی دُعائیں۔

رُخسانہ

دوبارہ خط پڑھنے کے بعد نسیمہ کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی اور جب اُس نے گردن کُرسی کے پچھلے حصّہ پر رکھکر آنکھیں بند کیں تو اُسے دیویوں کے سے رنگ روپ میں رُخسانہ

نظر آئی۔ اب نسیمہ کی سمجھ بھی کام کرنے لگی تھی۔ اور اسے معلوم ہوگیا تھا کہ رخسانہ کے الفاظ کی قیمت کیا تھی اور خاقان کے سر جھکانے کا راز کیا تھا۔ نسیمہ کے دل میں رُخسانہ کے لئے جو جگہ پیدا ہوئی تھی۔ اس میں بہ یک وقت محبّت۔ وقعت اور ہمدردی نے گھر کرلیا۔

رُخسانہ بڑھے ہوئے خیالات سے پریشان ہوکر ٹیلیفون پر آئی تھی اور شوہر سے باتیں کرنے کے لئے اُس کے پاس کوئی خاص موضوع نہیں تھا۔ لیکن اب وہ موضوع بھی رکھتی تھی۔ زندہ الفاظ اور زندہ اسلوب بھی۔

کون نسیمہ ——— ؟

جی ——— !

کیا بات ہے ——— ؟

جی گھبرا رہا ہے۔ جب سے رخسانہ گئی ہیں کوٹھی کھانے کو دوڑ رہی ہے۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ ؟

میں دو گھنٹے میں آرہا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ !

کتنی اچھی تھیں وہ۔ میرا بس ہوتا تو کبھی بھی نہ جانے دیتی۔ ؟

چند روز میں اس درجہ مانوس ہوگئیں۔ ؟

جی، تمھیں کیوں رشک ہو رہا ہے۔ ؟

خاقان بے ساختہ ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی میں زندگی کی گہری مسکراہٹ تھی۔ !

مَیں نے تو پاس رہ کر ابھی دیکھا ہو اگر پہلے سے مل جاتیں تو بس اُن سے محبّت کرتی اپنی طرف دیکھتی نہ تمھاری طرف ——— !

خاقان اور بھی زور سے ہنسا —— !

وطن گئے ہوئے کتنے دن ہو گئے۔ ؟

تم رخسانہ کے ساتھ کیوں نہ چلی گئیں۔ ؟

یہاں نسیمہ کو چُپ ہونا پڑا۔ لیکن وہ فوراً بول اُٹھی۔

تم نے چھٹی کہاں لی تھی۔ ؟

بس تمھاری محبت سو گئی۔ ؟ خاقان نے شرارت سے کہا۔

خدا رکھے۔ سو گئی ہے مَری نہیں ہے۔ رات کو نہیں تو دن کو جاگ جائیگی۔

نسیمہ بھی ہنس پڑی۔ !

تم اُن سے کتنی محبت کرتی ہو۔ ؟

سچ سچ بتاؤں کیا جھوٹ مُوٹ۔ ؟

سچ سچ ——— ؟

تم سے بھی زیادہ۔ ؟ ——— نسیمہ مزاحیہ لہجے میں بلا سوچے سمجھے کہہ گئی۔

نسیمہ ——— ؟ ؟ ؟ خاقان سکتے میں آگیا۔

نسیمہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ سنبھلی اور کمال متانت سے کہا۔

تم اُن سے محبت کرتے ہو۔ وہ تم سے محبت کرتی ہیں۔ مَیں سب کچھ جانتی ہوں۔ ؟

تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ ؟ خاقان نے سختی کے ساتھ ٹوکا۔

یہی کہ مَیں تم سے اور ان سے کسی طرح پیچھے نہیں رہوں گی۔ اُنھیں بھی چاہوں گی تمھیں بھی چاہوں گی۔ بلکہ تمھیں کم اُنھیں زیادہ ؟

جانتی ہو تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ؟

بالکل دیوانوں کی سی۔ !

خاقان کو پھر ہنسی آگئی۔ اور دو منٹ پہلے جو ہاہول سا پیدا ہوگیا تھا وہ دُور ہوگیا۔!

نسیمہ واقعی تمھیں سب کچھ معلوم ہے۔؟

بے شک ——!

اِس معلومات کے بعد مجھے کیا سمجھو گی۔؟

فرشتوں سے بھی کچھ زیادہ۔!

سچ ——؟

ہاں میرے سرتاج۔!

رُخسانہ سے تمھیں رنج تو نہیں ہے۔؟

کیا کہہ رہے ہو۔ وہ میری محسن ہیں۔ تمھیں بے انتہا خوشیوں کے ساتھ زبردستی میرے پاس کھینچ لانا اُن ہی کا کام تھا۔ مَیں بھولنا بھی چاہونگی تو بھی اُنھیں نہ بھول سکونگی۔!

تم کتنی اچھی ہو نسیمہ۔؟

وطن کب چل رہے ہو۔؟

جب تم کہو ——؟

اِسی ہفتے ——؟

بہت خوب۔ چھٹی کے لئے آج ہی درخواست دئے دیتا ہوں۔؟

جلدی سے گھر آجاؤ۔ سچ کہتی ہوں میرا جی گھبرا رہا ہے۔!

کہہ تو رہا ہوں۔ دو گھنٹے میں۔؟

اچھا تو پھر باتیں کئے جاؤ۔؟

تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔؟ یہ دفتر ہے۔

انچ انچ پاگل - میرے پاگل پن میں کسے شک ہوسکتا ہے - ؟

مجھے ــــــــ ؟

معلوم ہوا تم خود پاگل ہو - ؟

خاقان کو پھر ہنسی آگئی - !

دیکھو نسیمہ وقت ہوگیا ہے تم ریڈیو کھول لو اور مجھے کام کرنے دو - ؟

منظور - لیکن تم دو گھنٹے میں آرہے ہو - ؟

جی سرکار - !

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے - !

خاقان کی کوٹھی میں رخسانہ نہیں تھی۔ لیکن اس کا تذکرہ پوری عظمت کیساتھ موجود تھا۔ خاقان اور نسیمہ ہر وقت اُسی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اُسی کے گُن گاتے تھے۔ اُسی کی کہانیاں کہی جاتی تھیں۔ وہ اُن باتوں اور راتوں دونوں میں شریک تھی اور ہنسیوں قہقہوں اور کامرانیوں میں جگمگایا کرتی تھی۔ اُس کا اعزاز واقعی اعزاز تھا اور اُس نے صحیح معنیٰ میں اپنی رفعت نیکی اور ایثار کے ذریعہ خاقان اور نسیمہ کو زندگی کے شکنجے میں کس کر اپنی محبت کو زندۂ جاوید کرلیا تھا۔ آخر رخسانہ ایک اعلیٰ مسلم گھرانے کی شریف تعلیم یافتہ لڑکی ہی تو تھی۔

کہتے ہیں۔ آفتاب کی پہلی کرن اِسی مرتبہ کی حسین لڑکی کی معصوم پیشانی پر نچھاور ہوا کرتی ہے۔

پرچھائیاں

گرمی کی چھٹیاں ——— ؟ اُن کی لطافت۔ بانکپن اور مٹھاس کچھ کالج والے ہی جانتے ہیں۔ وہ محبت کے زمین آسمان، مسرت کی دُنیا۔ زیب وزینت کا زمانہ۔ سچ مچ جوانی کی راتیں مُرادوں کے دن۔ تصورات کے لہلہاتے ہوئے سبزہ زار۔ ہلکے ہلکے۔ دھیمے دھیمے نغمے جس طرح چمن چمن۔ شاخ شاخ۔ پتّے پتّے کو رعنائی دیتی ہوئی بہار آتی ہے۔ اسی طرح یہ دبی ہوئی آرزوؤں اور اُمیدوں کو اُبھارتی ہوئی آتی ہیں۔

وہ بھی خاص قسم کے ارادے اور اُمنگیں لے کر چھٹیاں گذارنے کے لئے گھر روانہ ہوا

اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس پُرسکون دَور میں دل کے وہ تمام صفحے کھول کر کسی کے سامنے رکھ دے گا۔ جو اُس نے رات کے آنسوؤں اور دن کی آہوں سے مُرتب کیے تھے۔

باتیں۔؟ تم اتنی دیر سے باتیں نہیں کر رہے تھے۔؟

ہاں ہاں مگر ——!

اچھا کرو باتیں ——؟

تم اِس قدر سنگ دل کیوں ہو۔؟

اِسے سنگ دلی کہتے ہیں۔؟ وہ ہنس پڑی۔

تم باتیں ہی کرنا چاہتے ہو۔ شوق سے کرو۔ میں کہہ تو رہی ہوں۔؟

ہم سو میل کا سفر طے کر کے آئیں اور تم........؟

یہ کیوں نہیں کہتے گرمیوں کی چھٹیوں میں آئے ہو۔؟

لیکن آئے تو تمھارے لئے ہیں۔ ورنہ چھٹیاں گذارنے کے لئے بہت سے خوشگوار مقامات ہو سکتے تھے۔!

سچ ——؟ اُس نے تعجب سے کہا۔ جیسے اُسے یقین نہیں تھا۔

نہیں جھُوٹ ——؟

اچھا جب تم کہتے ہو میں آتی ہوں یا نہیں۔؟

آتی ہو پر شرارت۔ ضد اور بد دلی کے ساتھ۔!

اور کس طرح آتے ہیں ——؟

اس نے اِس طرح اُس کی طرف دیکھا۔ جیسے واقعی اُسے کلیجے میں رکھ لے گا۔

تمہیں یہ ستمگری کس نے سکھائی ہے۔؟

تم نے ——!

میرا بس ہوتا۔ تو …… اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ آنکھوں میں آنسوں سے جھلک گئے۔

سارا دیس تمہارے بس میں ہے ——؟

سب ہیں۔ ایک تم نہیں ہو —!

وہ بے ساختہ مُسکرادی —!

ہمارے ہاں کل سے اسی لئے نہیں آئیں نا۔ کہ میں آیا ہُوا ہُوں —؟

جی ہاں تم پریشان جو کرتے ہو۔ پچھلی دفعہ میری کلائی پر زبردستی گھڑی کیوں باندھ دی تھی —؟

یوں ہی جی چاہا تھا۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔؟

مجھ سے کھیلنا چاہتے ہو۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ تمھارے پاس دھن ہے، دولت ہے۔ رجا پجا گھر ہے —؟

اور پہلو میں محبّت بھرا دل بھی ہے؟

مگر کون کہہ سکتا ہے کہ کل بھی وہی رہو گے جو آج نظر آرہے ہو۔؟

اگر یہی بات ہوتی تو ہر ہفتہ بھاگ کر کیوں آتا۔ خیر تم مجھے ٹھکرا سکتی ہو میں تمھیں نہیں بھلا سکوں گا —!

پیسے والے جوانی میں یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم نے قسمیں نہیں کھائی ہیں —!

خدا جانے تمھیں میری سچائی کا یقین کب آئے گا۔! اس نے لمبی سی ایک آہ بھر کر کہا۔

جب تمھاری والدہ کسی اونچے گھر سے زیوروں اور اشرفیوں سے لدی ہوئی ایک چاندسی دُلہن لے آئیں گی۔؟

وہ کلپ گیا۔ اور آنسوؤں کی جھڑی کے ساتھ گھر چلا گیا۔!

وہ کھڑی رہی لیکن اُس کی نگاہ زمین پر جمی ہوئی تھی۔

یہ رنگ و بُو میں ڈوبے ہوئے دو سائے تھے۔ انجم اور منظر۔ سُنا ہے اودھ کے پھولوں میں بسی ہوئی اس لبتی نے مدّت کے بعد اس شان کی دو جوانیاں دیکھی تھیں جن کے حسن کی بہار براہِ راست اودھ کی شام کو چیلنج کرتی تھی۔ آئیے پہلے انھیں دیکھ لیجئے۔

انجم —— ؟ خوش رو۔ خوشنما اور دیکھنے دکھلانے کی حد تک خوبصورت۔ طبیعت میں کُوٹ کُوٹ کر بھری شوخی۔ نگاہوں میں جوانی کا کھیلتا ہوا نشہ۔ زبان میں لوچ۔ بیان میں جادُو۔ بہت سے کھیتوں۔ زمینوں اور مکانوں کی مالک بیوہ ماں کا اکلوتا لڑکا۔ کالج کا طالب علم۔ پیسے کا غم نہ خرچ کی پروا۔ تمام خاندان کے لئے ایک خوشنما سا پسندیدہ کھلونا دونوں دونوں ہاتھوں سے روپے کی بکھیر کی جا سکتی تھی اور جوانی کے ہر اشارے کو شباب و شعر میں غرق کیا جا سکتا تھا۔ مگر ماں نے بچّے کو اس ڈھنگ سے اُٹھایا تھا کہ کالج کی رنگین فضا بھی اپنے ہنگاموں کے ساتھ اُسے جذب نہیں کر سکی۔ اس کا لباس۔ اس کا کمرہ۔ اس کی چیزیں۔ سب مزاج کی طرح شگفتہ۔ شستہ اور شائستہ۔ اِس سرے سے اُس سرے تک تازگی ہی تازگی کار فرما۔ زندہ دلی کا یہ عالم کہ اُس کے بغیر محفل مکمّل، نہ محفل والے مسرُور۔ دماغ سے اُتار اُتار کر باتیں کرنے کا چسکا۔ باتوں سے راتوں کو شکست دینے اور صاف ستھرا مذاق کرنے کی عادت۔ لڑکے اور لڑکیوں میں اِس طرح

گھل مل جانا جیسے وہ زندہ دلی کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ لیکن اس ہمہ رنگی کے باوجود
رسمی دوستی۔ رواجی محبت اور ہر تیسرے درجہ کی بات سے پرہیز۔ کیا مجال جو نگاہ بھٹک
کر کہیں اُلجھ جائے یا گھٹیا درجہ کی کوئی حرکت ظہور میں آئے۔ یہی سبب تھا کہ اُس پر آبرومند
نگاہیں پڑتی تھیں۔ عزت کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ دوستوں نے بارہا اپنی شورشوں سیر
سپاٹوں اور پارٹیوں میں شریک کیا تھا لیکن اچھے انجم کے سوا اور کچھ نہیں پایا تھا۔ کئی
دُبلے پتلے ساتھی اُڑائے اُڑائے پھرانے کے بعد ہار مان چکے تھے۔ متعدد کالج بھر کی نگاہوں
میں جگمگانے والیاں اپنے رومال پھینک پھینک کر مایوسی کیساتھ خود ہی اُٹھا چکی تھیں۔

منظر ——— ۹ ایک جوانی بھری دوشیزہ۔ نوک پلک۔ قد قامت۔ چہرے مہرے
میں حُور کی سی جھلک۔ جوانی بھی جس کی بلائیں لیتی تھی۔ اُس کی اداؤں میں کفر تھا نگاہوں
میں شہنشاہوں سے کھیلنے والا خمار۔ کسی اچھے افسانے کی ہیروئن سے زیادہ خوبرُو۔ نغمے
سے زیادہ لطیف۔ بہار سے زیادہ حسین۔ الفاظ سے زیادہ شوخ۔ بیان سے زیادہ دلفریب
اُن مہ جبینوں میں سے ایک جنھیں دیکھ کر مہ و انجم کانپا کرتے ہیں جن کے مُنہ نہ چھپانے
پر بھی مُسکرانے کا انداز اُڑایا نہیں جاسکتا۔ ایک غریب بیوہ ماں کی بھولی بھالی غریب
لڑکی۔ طبیعت میں حیا کے ساتھ ملی ہوئی تروتازگی۔ مزاج میں حُسن سے زیادہ نفاست
رفتار اور گفتار میں قیامت کے آثار۔ پڑھنے لکھنے کا گہرا شوق۔ سینے پرونے کا سلیقہ۔
پسندیدہ اطوار اچھی عادتیں۔ اپنے سائے سے بھی اُچھل پڑنا۔ بے نیازی کیساتھ چلنا پھرنا
اور گذر جانا۔ غریبی کا احساس نہ روپے پیسے کا فکر۔ لباس میں سادگی۔ گلے میں موتیوں کا ہار۔
پھول سے کانوں میں پھول سے آویزے۔ جیسے عرش پر نور کی قندیلیں لٹک رہی ہوں
اسکول میں تعلیم پانے کا مقدور نہیں تھا گھر پر ذہانت سے پڑھنا لکھنا سیکھا تھا۔ اور اپنے

ماحول کو پُرسکون بنالیا تھا۔ اُس کے پاس دولت نہیں تھی لیکن وقار تھا۔ اور مُنہ سے پھولوں کے ساتھ متانت کے موتی بھی جھڑتے تھے۔ بات کرنے اور شرمانے کا وہ انداز تھا جس کی تاب نہ لاکر غنچے بھی آشفتہ ہو جاتے ہیں۔

انھیں دیکھ چکے اب قدرت کا کار۔ کرشمہ اور حکمت دیکھئے۔ وہی انجم ——؟ جسے کالج کی ہوائیں۔ فضائیں۔ اور بلائیں اپنی طرف کھینچ نہ سکی تھیں۔ اور جسکی سنجیدگی مشرق و مغرب کے نمائندہ شبستانوں میں خاصی دیر سانس لینے کے بعد بھی سنجیدگی ہی رہی تھی۔ پوری نیازمندی کے ساتھ منظر کی البیلی اداؤں اور مشکبو زلفوں کی گھنی گھنی چھاؤں میں جھولتا ہوا نظر آیا۔ اُس کا دل اِس صورتِ زیبا پر اس غضب سے ٹوٹ کر آیا تھا کہ اُسے اپنا اپنی حیثیت اور اپنے لیل و نہار کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

انجم نے منظر کو پہلی بار اپنے ہاں دیکھا تھا۔ اس سے چند میٹھی میٹھی باتیں کی تھیں۔ اور پھر ایک دم تڑپ کر، چند لمحے سوچ کر اپنے کالج کی دل کشی۔ ثروت کا عروج اور طبیعت کا جوہر اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ اس حادثہ کے بعد پھر انجم کے لبوں پر تبسم۔ چال میں مستی اور آنکھوں میں اُڑتی ہوئی سی لکیریں بہت کم دیکھی گئیں۔ آپ اُس منظر کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ آیئے وہ بھی دکھادیں۔

آدھی رات کے بعد

منظر ——————

چھوٹا سا سجا سجایا آراستہ کمرہ۔ دوسری طرف شادی کا ہنگامہ۔ اِس طرف خاموشی۔

فضا ——————

چھٹکے ہوئے تارے۔ چاندنی رات۔ بھیگی بھیگی سی ہوا۔

بائیس تئیس سال کا ایک سجیلا نوجوان۔ چہرے پر چمپا اور چنبیلی کا سا رنگ۔ آنکھوں میں کچھ نیند کچھ مطالعہ کا شوق۔ تھکے ہوئے ہاتھ پاؤں۔ بے ترتیب بال۔ جسم پر بنیان اور مہین ململ کا کرتہ۔ آرام کرنے کی خواہش۔ پڑھنے کی دُھن۔ افسانہ نگار کی سی محویت کے ساتھ مسہری پر لیٹا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد ہوا کے جھونکوں سے آنکھیں بند ہونے لگیں اور اُس نے بے لطفی سے کتاب بند کرکے میز پر رکھ دی۔ لیکن ابھی سونے نہیں پایا تھا کہ اُسے پہلے کمرے میں آہٹ سی سُنائی دی اُس کے بعد کسی کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرنے کی آواز۔ وہ گھبرا سا گیا اور ڈرتے ڈرتے بجلی کا بٹن دبا یا۔ کمرہ ایک دم روشن ہو گیا۔ اُس کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اُسے اپنے سامنے ایک خوبصورت لڑکی دکھائی دی۔ روشنی ہوتے ہی لڑکی ششدر رہ گئی۔ نہ اُس سے بھاگا گیا نہ مُنہ چھپایا گیا۔ بالکل سکتے کا سا عالم۔ نوجوان آہستہ آہستہ قریب آیا۔ اس نے خواب کے شبہ میں ایک دفعہ اپنی آنکھیں زور سے مل ڈالیں۔

تُم ——— ؟

وہ پتھر کی مورتی بنی رہی۔ !

کہاں سے آئی ہو۔ ؟

برابر کی چھت سے۔ !

اِس وقت یہاں کیسے آئیں ۔ ؟

ہم کھیل رہے تھے ۔ !

اوہ ۔کھیل رہی تھیں اِس وقت ۔ ؟

لڑکی نے بھولپن سے اقرار کر لیا ۔ !

کیا کھیل رہی تھیں - ؟

آنکھ مچولی ــــــ !

اوہ - اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا - شادی کی سہیلیاں اکٹھی ہوں گی - ؟

لڑکی کے چہرے پر حیا آ گئی ــــــ !

یوں کہو کہ تم .... ؟

ہاں ہاں، لڑکی نے اثبات میں گردن ہلائی - !

چھپنے آئی تھیں ــــــ ؟

لڑکی دھیرے سے ہنس پڑی - !

چور بننا نہیں چاہتیں .... ؟

جی ــــــ !

نوجوان نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا - اب تو چور بن گئیں - ؟

کیسے - ؟

میں نے پکڑ جو لیا ــــــ !

لڑکی بھی شگفتہ ہو گئی - اور نوجوان کا خوف بھی جاتا رہا - !

ایک بات بتاؤ گی - ؟

نہیں ــــــ لڑکی نے سادگی سے جواب دیا - !

اور اِس سادگی پر نوجوان کا دل لوٹ گیا - !

کیوں - ؟

میں جانا چاہتی ہوں - !

یہاں چُھپنے کی سوجھی خوب - ؟

لڑکی شرما گئی - !

کہاں رہتی ہو - ؟

مال خانے کے اوپر کمرے میں - !

منصرم صاحب کے ہاں - ؟

میں اُن کی ہی لڑکی ہوں - !

نوجوان کی رگوں میں خون دَوڑنے لگا - !

مَیں نے تمھیں کبھی نہیں دیکھا - ؟

مَیں اپنی ننھیال میں رہتی تھی - !

تمھاری والدہ نے مجھے اپنی گودوں میں کھلایا ہے - ؟

مَیں سمجھ گئی - اچھا اب جاتی ہوں - ؟

نوجوان بے چین ہو گیا - !

مجھے جانتی ہو — ؟

ہاں ——— !

بتاؤ ——— ؟

چھوٹے سرکار ——— !

اُس کے جسم میں سنسنیاں پیدا ہو گئیں

لڑکی جانے لگی — !

تھوڑی دیر تو اور ٹھہرو — ؟

لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہوں گی ۔ ؟

اچھا دیکھو پھر یہیں آکر چھپنا ــــــــــ ؟

نوجوان دروازہ کھولنے لگا تو اس کا دل بے تاب ہو گیا ۔ !

کل پھر آؤ گی ۔ ؟

کیوں ۔ ؟

باتیں کریں گے ۔ تمھاری باتیں بہت اچھی ہوتی ہیں ۔ ؟

لڑکی دہم رہ گئی ۔

وہ چلی گئی اور نوجوان دل پکڑ کر بیٹھ گیا ۔ تمام رات آنکھیں دروازے پر لگی رہیں ۔ !

یہ انجم اور منظر تھے ۔ ــــــــــ

اس اتفاق نے انجم کی دنیا بدل ڈالی ۔ وہ بُری طرح منظر کا گرویدہ ہو گیا ۔ اور اس سے ملنے باتیں کرنے اور سایہ کی طرح ساتھ رہنے کے لئے بیکل نظر آنے لگا ۔ اسکی بیکلی کے لئے ایک کل کا پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ منظر اُس کے مرحوم منصرم جائداد کی لڑکی تھی اور اس کی والدہ اور منظر کی والدہ میں ٹھیک اسی طرح اُنس تھا جس طرح اُس کے ابا جان اور منصرم صاحب میں زندگی بھر رہ چکا تھا انجم منظر کی والدہ کے آغوش میں بارہا کھیل چکا تھا اور بلا تکلف اُنکے ہاں جا سکتا تھا ۔ منظر کی والدہ غریب عزت دار خاتون تھیں اور مرحوم نواب صاحب کی وصیت کے مطابق انجم کی والدہ کی طرف سے ایک خاص رقم انھیں ملا کرتی تھی ۔ دونوں گھروں سے اب آقا اور ملازم کا سوال اُٹھ چکا تھا ۔ بلکہ اپنوں کی سی بات پیدا ہو گئی تھی ۔ انجم وہاں شان و شوکت کے ساتھ گیا ۔ منظر سے ملا اور پورے جوش کے ساتھ ملا ۔ اُسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا ۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر سکون پاتا تھا ۔

انجم خوبصورت بھی تھا اور خوب سیرت بھی۔ اور بظاہر منظر کے لئے کوئی وجہ نہیں تھی۔ کہ خوشگوار سلوک نہ کیا جاتا لیکن انجم جس تیزی سے اس کے سامنے جھکتا رہا اُسی تیزی کے ساتھ اُس کا سر اونچا ہوتا رہا۔ وہ انجم سے ملتی بھی تھی باتیں بھی کرتی تھی پر کامل بے نیازی کے ساتھ اُس کی باتوں میں دلرُبائی تھی نہ برتاؤ میں دل نوازی۔ انجم نے پہلے دل پیش کیا۔ پھر باری باری ہنسی مسکراہٹ۔ قہقہے اور گدگدیاں — یہ بھی اُسے نہ پاسکیں تو تحفے تحائف کا سلسلہ شروع کیا گیا ساریاں۔ سونے کی چوڑیاں۔ آویزے۔ کنگن اور انگوٹھیاں۔ مگر منظر کی نگاہوں نے اُنھیں بھی چُوم لینے سے انکار کیا۔ انجم نے لاچار ہو کر مایوس نگاہوں۔ آہوں اور آنسوؤں سے کام لیا۔ پھر بھی منظر کی بیگانگی خلوص سے نہیں بدلی اور وہ بے پروائی کیساتھ اپنے مقام پر دکھائی دی۔

اب انجم تھا اور اضطراب اس نے چُپکے چُپکے التجائیں کیں مجبُوریاں سامنے رکھیں خوشامد سے پیش آیا۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو انجم راستہ روک کر کھڑا ہو گیا وہ چُپ چاپ اُس کے سامنے کھڑی تھی۔

مجھے جانے دو۔ اُس نے تیور میں بل ڈال کر کہا۔ ؟

انجم نے ایک آہ کے ساتھ اوس کا منہ اونچا کر دیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں

مُجھ سے کچھ ناراضگی ہے۔ ؟

مَیں کسی سے ناراض نہیں ہوتی۔ ؟

پھر الگ الگ کیوں رہتی ہو۔ ؟

تم پر تو ہر وقت وحشت سوار رہتی ہے۔ ؟

منظر تمھیں مجھ پر رحم بھی نہیں آتا۔ ؟

نہیں تو مَیں ظلم کیا کرتی ہوں ۔ ؟

اور ظلم کسے کہتے ہیں ۔ ہر چیز سے انکار ۔ ہر وقت غصّہ ۔ ؟

پھر مجھ سے دُور کیوں نہیں رہتے ۔ ؟

اور جو کوئی غصّہ پر بھی پیار کرتا رہے ۔ ؟

اُسے تم بے وقوف کہہ سکتے ہو ۔ ؟

انجم کو فلسفی کے سے اس انداز پر واقعی پیار آگیا ۔ اُس نے منظر کے دونوں بازو پکڑ لئے ۔

تم یوں ہی ستم کرتی رہو ۔ مَیں یوں ہی پیار کرتا رہوں ۔ ؟

چھوڑ دو ——— ؟ وہ ترشروئی سے بولی ۔

کونسے دل سے چھوڑ دوں ——— ؟

مَیں اب نہیں آؤں گی ——— ؟

کیوں نہیں آؤ گی ——— ؟

میری مرضی ——— ؟

مَیں خود تمہارے ہاں آجاؤں گا !

منظر ہَول گئی ۔

پھر وہی وحشت ——— ؟

تمہارے غرور کے سامنے کوئی صرف وحشی ہی بن کر رہ جائے تو غنیمت ہو ورنہ ..... !

خدا کے لئے راستہ دے دو ۔ ؟

وعدہ کرو اسی طرح آجایا کرو گی ۔ ؟

تم بھی دِق نہیں کرو گے۔؟

منظر کے اِس ناروا سلوک سے انجم مایوس تو ہوا مگر محبت میں کمی نہیں ہوئی اور منظر روز بروز اُس کی زندگی میں سماتی چلی گئی۔ وہ قطعی دل دے کر بات کرتی نہ حوصلہ افزائی سے کام لیتی۔ مگر انجم کو ہر ہفتہ گھر آنا ضرور تھا۔ وہ اتوار کا پُورا دن منظر کے پاس گذارتا اور رات کو آنسوؤں کی جھڑی کے ساتھ واپس ہوتا۔ ہر بار چلتے وقت دل میں یہی عہد کرتا تھا کہ اب اس ستم کیش کے پاس نہیں آؤں گا۔ لیکن ہفتے کی صبح کو بیدار ہوتا تو منظر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اُس کے سامنے اِس قیامت سے آجاتی کہ وہ سہ پہر کو بھاگم بھاگ اسٹیشن پہنچ جاتا۔

منظر کی سخت دِلی میں کیسے شک ہو سکتا ہے معمولی حیثیت کی لڑکی کے سامنے ایک نواب زادہ جُھک رہا تھا جو شکل وصورت میں اُس سے کسی طرح کم نہیں تھا اور وہ برابر تن رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ انجم کے بُلاتے ہی آجاتی تھی اور اتوار کے روز اُس کی بھی آس بندھی رہتی تھی کہ اب کوئی آئے گا۔ منت کرے گا۔ منائے گا۔ وہ بگڑے گی رُوٹھے گی اور منے گی نہیں۔ اُس دن وہ معمول سے زیادہ بناؤ سنگھار کرتی اور قیامت بن کر اُس کے پاس آیا کرتی۔

انجم بہت دن پریشان رہا تھا۔ بہت کچھ سوچتا رہا تھا۔ ایک طرف تعلیم حاصل کرنے کی مُہم تھی۔ دوسری طرف تمناؤں کی پامالی کا مسئلہ۔ آخر اُس نے دل کا معاملہ گرمی کی چھٹیوں پر رکھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اِس طویل زمانے میں وہ یکسوئی کے ساتھ منظر کو اپنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

انجم بڑی توقعات کے ساتھ گرمی کی چھٹیوں میں گھر پہنچا تھا اور رات خوابِ خیال کی

بھول بھلیاں اور تاروں سے اُلجھتی ہوئی آنکھوں میں کاٹ کر صبح ہی منظر سے ملا تھا۔ لیکن بدستور روتا ہوا واپس آیا تھا۔ اور اس مرتبہ چلتے چلتے اُس کافر نے امیری غریبی کا جو سوال اُٹھایا تھا اس کی کوفت بھی ساتھ لایا تھا۔ انجم محبت کرتا تھا دل وجان سے محبت کرتا تھا اُس کے دل میں کسی قسم کا چور تھا شوخی تھی نہ شرارت۔ بارہا منظر اُس کے ساتھ رہی تھی اور انجم کا یہ عالم کہ دل میں طوفان۔ آنکھوں میں طوفان۔ آرزؤں میں طوفان۔ وہ اُس کے ہمراہ بجائے خود طوفان۔ مگر نگاہوں سے پیار کرنا۔ اور تڑپ تڑپ کر رہ جانا۔ یہی اُس کا معمول تھا اور دل کی پاکیزگی نے یہیں تک بڑھنے کی اجازت دی تھی۔ پھر انجم نے اُسے دیوی کی طرح سامنے رکھا تھا۔ کھلونا سمجھ کر کھیلنے کی کوشش نہیں کی تھی اور بھول کر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اُسے زندگی کے اَدھورے راستے میں چھوڑ کر آگے چلا جائے گا۔ منظر کے شبہات اور غلط روش نے اس طرح انجم کے دِل پر ضرب لگائی کہ اُمیدوں کی آئینہ بندیاں بھی سہارا نہ دے سکیں اور اُس نے پُورے طور پر شکست کھا کر تہیہ کر لیا کہ آئندہ منظر سے نہیں ملے گا۔

کتنے ہی دن انجم دل برداشتہ رہا اور منظر سے ملنے اُسے بُلانے اور اپنے آپ جانیکی ضرورت نہیں سمجھی۔ ہر وقت گھر میں پڑا رہنا۔ کتابیں پڑھنا اور کبھی کبھی گھبرا کر شکار کو چلے جانا اسی قسم کی مصروفیت سے منظر کو بُھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کے لئے زندگی میں کوئی کشش نہیں تھی۔ دِل ٹوٹ چکا تھا۔ توقع چھوٹ چکی تھی غم سب کچھ لُوٹ چکا تھا۔ اب لباس کی سجاوٹ کا ہوش تھا نہ پہلی سی زندہ دلی باقی رہی تھی۔ دن رات لبوں پر آہیں سی۔ آنکھوں میں آنسو سے۔ گہری وارفتگی۔ ہلکی ہلکی وحشت۔ اُس کی مایوسی اور پژمردگی صاف کہہ رہی تھی کہ یاس واَلم یوں ہی رہے تو رات کو رونے کے لئے انجم کے پاس آنسو رہیں گے نہ

دِن کو فریاد کرنے کے لئے آہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو کھو کر پھر نہ پا سکے گا۔

انجم سہ پہر کو اپنے کمرے سے باہر نکلا تو اُسے دالان میں اپنی والدہ، منظر اور اُسکی والدہ بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ اُس کے پاؤں جم گئے۔ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ ایک دفعہ واپس ہونے کو بھی ہوا، لیکن منظر کی موجودگی میں جی نہیں چاہا۔ خود بخود اُس کے قدم آگے بڑھنے لگے۔ وہ ایک نظر ڈالتا ہوا دیوان خانے میں چلا گیا اور لمبی سی آہ کے ساتھ آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔

منظر کی شبیہ اپنی ساری جگمگاہٹ کے ساتھ انجم کے رُوبرو آگئی۔ اور اُسکے چُپکے چُپکے مُسکرانے اور رُخِ روشن پر تن کر دوپٹے کے جھرمٹ مارنے کا انداز آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ کتنے ہی دنوں سے منظر کو فراموش کرنے کی سعی کر رہا تھا لیکن اُسے کون بتاتا کہ حسن میں یہ اثر۔ یہ بات۔ یہ طلسم نہ ہوتا تو اُسے جانِ بہار کہنے کی ضرورت کیوں سمجھی جاتی۔ جس طرح عہدِ گل آتے ہی شاخوں۔ ٹہنیوں اور پھول پتّوں میں جان پڑ جاتی ہے اور شاخیں لچکر۔ غنچے چٹک کر اور پھُول مہک کر بہار کی خوشیاں مناتے ہیں اسی طرح یادِ جاناں مُرادوں امیدوں اور آرزوؤں میں تر و تازگی پیدا کر دیتی ہے۔ انسان جنّت کی سی بہاروں میں جھُولنے لگتا ہے اور دل مسرّت کے ہجوم میں جھُوم جھُوم جاتا ہے۔ اُس کا رومان بھی جاگ اُٹھا اور وہ منظر کے متعلق دوبارہ سوچنے لگا۔ ایک طرح کی کیفیت سے آنکھیں بند ہو گئیں۔

اسی اثنا میں کوئی چھم سے اندر داخل ہوا۔ انجم چونک پڑا۔ سامنے منظر کھڑی تھی۔

اُس نے ایک پرائیویٹ سکریٹری کی سی چابکدستی کے ساتھ سلام کیا۔!

انجم کو تعجب تھا ——— ! خلافِ توقع یہ سلام کیسا۔؟

مزاجِ مُبارک ——؟

زندہ ہیں تمھیں دُعائیں دیتے ہیں۔!

دیکھنے والوں کو سمجھانے کے لئے یا دل سے۔؟

تمھاری یاد اس شان سے آتی ہو کہ بے اختیار دل سے دعائیں نکل جاتی ہیں۔؟

چند لمحوں کے لئے دونوں خاموش ہوگئے۔ انجم نے اس خاموشی سے فائدہ اُٹھایا

آپ کا مزاج ——؟

اپنی جگہ ہے۔ مطلب یہ کہ اچھا ہے۔!

انجم سٹپٹا گیا۔!

مجھے ستانے میں کچھ سکون ملتا ہے۔؟

تمھاری دشمن ہوں نا۔؟

جی نہیں دوست۔ انجم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

بات بات پر رونے کی عادت نہیں گئی۔؟

انجم چپ رہ گیا۔!

منظر دل پر چوٹ لگتی ہے تو آنکھیں ڈبڈبا ہی جاتی ہیں۔!

دِل ابھی تمھارے ہی پاس ہے نا۔؟ منظر نے گہری شرارت سے ٹوکا۔

انجم شرمندہ سا ہوگیا۔ اور قدرے پیار کے ساتھ اُسے کرسی پر بٹھا دیا۔

یہ چہرے پر پریشانی کیوں ہے۔؟ منظر کے ہونٹوں پر پھر تبسم تھا۔

کسے خبر ہے۔؟ انجم نے شکوہ کی نظر سے جواب دیا۔

یہ گُمان ہوتا ہے جیسے کسی سے محبت کرنے لگے ہو۔؟

معلوم تو مجھے بھی ایسا ہی ہوتا ہے ——؟

ٹھیک نہیں بتا سکتے ——— ؟

وہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیتی - ؟

بہت ظالم معلوم ہوتی ہے —— ؟

نہیں تو۔ اُس سے زیادہ شاید ہی دنیا میں کوئی محبت کر سکتا ہو - ؟

تم بھی اُسے چاہتے ہو - ؟ منظر نے ہنس کر کہا -

بالکل نہیں - وہی پیچھے پیچھے پھرا کرتی ہے - ؟ انجم نے کالج کے زمانے کی شوخی کو آواز دے کر جواب دیا -

منظر ایک منٹ کے لئے سوچ میں پڑ گئی - لیکن فوراً ہی سرکاری وکیل کی سی ذہانت کے ساتھ بولی -

پھر پریشان کیوں ہو - منہ پر ہوائیاں سی اُڑ رہی ہیں - ؟

ایک بات کا فکر ہے - ؟ انجم نے متانت سے کہا -

ایسی کیا بات ہے — ؟

وہ اب گھر تک پہنچنے لگی ہو - ڈر رہا ہوں کہ والدہ کو پتہ لگ گیا تو آفت آجائے گی - ؟

گھن کی چوٹ تھی - تاہم وہ سرکاری وکیل کی طرح ہارنا نہیں جانتی تھی -

نکال کیوں نہیں دیتے - ؟

انجم نیچے کا ہونٹ دانتوں میں دبا کر رہ گیا -

بولو ——— ؟

جی نہیں چاہتا - !

دونوں ہنس پڑے -

انجم نے عہد کیا تھا کہ آئندہ منظر سے کوئی استدعا نہ کی جائے گی۔ خاصے دنوں تک عہد کی پابندی بھی کی تھی۔ مگر جب منظر جانے کے لئے کھڑی ہوئی تو انجم کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ اُس نے محبت سے ہاتھ پکڑ لیا اور پہلے سے بھی زیادہ بے قراری اور مجبوری کے ساتھ کہا۔

منظر اب تو مان جاؤ۔؟

کیوں ——؟

بہت دِق کر چکیں۔؟

دیکھو انجم تم حد سے بڑھے جا رہے ہو مَیں تمہاری بات نہیں مانوں گی۔؟

یہی خوف ہے نا کہ آگے چل کر تمہیں یاد نہ رکھ سکوں گا۔؟

یہ بات نہیں ہے۔؟ منظر آج پہلی بار سنجیدگی سے بولی تھی۔

پھر کیا بات ہے۔ خدا کے لئے بتا دو۔؟

تمہاری والدہ منظور نہیں کریں گی اور ....!

کہے جاؤ —؟

تم اُن کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکو گے۔؟

منظر ایک دم کمرے سے باہر چلی گئی اور انجم کانپتا ہوا رہ گیا۔

منظر کے چلے جانے کے بعد انجم پیدا شدہ حالات پر غور کرنے لگا منظر کو چھوڑنا یقیناً اُس کے بس میں نہیں تھا۔ ورنہ اتنی بیزاری کے بعد ضرور علیحدگی اختیار کر لیتا اپنی والدہ اپنی والدہ کے متعلق اُسے بھی شبہ ہو گیا کہ کہیں منظر کا اندیشہ سچ نہ ہو جائے۔ اب ایک نئی خلجان

تھی جس نے اور بھی پریشان کر کے رکھ دیا۔ آج تک اُسے اپنی والدہ کا خیال آیا تھا نہ یہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت پیشِ نظر ہوئی تھی۔ انسان پر ایک غم ہو تو کسی نہ کسی طرح ٹالا جا سکتا ہے۔ مگر جب دو غم مل جاتے ہیں تو پوری طرح اُن میں ڈوب جانا پڑتا ہے۔ آس پاس کے لوگ اُس میں تبدیلی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور اُس کی زندگی پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔

انجم کی وارفتہ مزاجی بھی عام نگاہوں میں کھٹکنے لگی۔ اور دوستوں نوکروں خادماؤں کی کانا پھوسی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اُس کی والدہ نے بیٹے کی خشک آنکھیں اور اُترا ہوا پھیکا چہرہ دیکھا تو اُن کا دل بتاشے کی طرح بیٹھنے لگا۔ یہ وہی بچہ تھا جس کا پنڈا گرم ہوتے ہی گھر بھر میں کھلبلی مچ جاتی تھی ——— ماں نے بچے کا دُکھ معلوم کرنے کے لئے جستجو کی۔ مگر اُس کے قریب رہنے والے طبیعت کی اچانک ناسازی کے سوا اور کچھ تشخیص نہ کر سکے۔ اس سے پوچھا گیا تو وہ اور بھی سٹپٹا گیا کہ اس ناگہانی آفت کا کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ اس کے پاس ڈاکٹر صاحب بھی آئے تھے اور باتوں باتوں میں نبض دیکھ لی گئی تھی۔ مولوی صاحب کا پھیرا بھی ہوا تھا۔ اور تسبیح پھیرتے ہوئے انھوں نے دم بھی کیا تھا۔ مگر لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ اُسے دواؤں اور دُعاؤں سے زیادہ اُس وقت کسی کی نگاہوں کی ضرورت تھی۔ انجم نے صورتِ حال کا گہری نظر سے مُطالعہ کیا اور رفتہ رفتہ اپنے آپ کو بدلنا شروع کر دیا۔ یوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس رات کے نالوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور حسبِ دستور سیر کو جانے۔ کتابیں پڑھنے اور بال بنانے کی رسمیں ادا کی جانے لگیں۔ گھر والوں کو سکون ہوا۔ دوست خوش ہو گئے۔ انجم اپنی دُھن میں لگ گیا۔ مگر ماں کے دل میں ٹھنڈک پڑ جانے کے بجائے ایک اضطراب بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اُنھیں رات کو نیند بھی ذرا کم آنے لگی تھی اور آنکھیں مختلف دروں گھروں اور خاندانوں کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی تھیں۔

منظر کو انجم کی شان و شوکت اور اُس کی والدہ کی اُمنگوں کا بھی اندازہ تھا اور اپنے پر بھی نظر ڈال چکی تھی اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ماں کی سنہری مامتا ہرگز کسی غریب کا دل رکھنے کی اجازت نہیں دیگی۔ لڑکے کی نوجوانانہ محبت بھی اُس کی نگاہ میں کچھ کم سطحی نہیں تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ پوری مضبوطی کے ساتھ اِس آندھی کو روک رہی تھی جس کا ایک ہی جھکڑ اِس کے تنکوں کی چھوٹی سی حسین دُنیا کو برباد کرسکتا تھا۔ اِس خطرے کے علاوہ انجم کی خوبصورتی میں شک تھا نہ رفعت اور محبت میں۔ اُس کی کونسی بات تھی جس میں اپیل کرنے والی رُوح موجود نہیں تھی لیکن یہی ہَول تھا جس نے اسے دُور رکھا تھا اور دل میں میٹھی میٹھی چنگاریاں سلگنے نہ دی تھیں۔ اِس دوری کے باوجود اُسے انجم کو رُلانے۔ تڑپانے اور ٹھونک ٹھونک کر جلانے میں لُطف آتا تھا۔ اُس کی یہی خواہش تھی کہ انجم اسی طرح ہاتھ جوڑ کر خوشامد کرتا رہے اور وہ بے نیازی کے ساتھ ہنستی رہے۔ دراصل انجم کے جُھکنے سے تھوڑی دیر اُسے دیوی کی سی آن بان کے ساتھ بالادستی کا موقع مِل جاتا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اِس موقع کو ہاتھ سے دے کر اپنے احساس کو مجرُوح کر ڈالے۔

انجم اسی اُدھیڑبُن میں رہا کہ منظر کے دل پر سے یہ غبار کسی طرح دُور کیا جائے اُس نے مقدور بھر کوشش کرلی تھی اور کامیابی کی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ آخر کئی دن غور و فکر کرنے کے بعد وہ خلافِ معمول رات کے وقت منظر سے ملا۔ وہ آتو گئی مگر گھبرائی ہوئی سی۔

میں اس طرح اب نہیں آؤں گی۔ ؟

آج کے بعد میں بُلاؤں گا بھی نہیں۔ ؟ انجم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پھر کچھ وحشت ہوئی ہوگی۔ ؟

یہاں وحشت کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ ؟

آج کل دولت کا نام وحشت رکھدیا گیا ہے۔؟

جیسے انجم نے کچھ سنا ہی نہیں۔!

کچھ دیر کے لئے سیر کو چل سکتی ہو — ؟

کیوں ——— ؟

چند باتیں آخیر بار کہنی ہیں — ؟

کہیں جا رہے ہو — ؟

جی ہاں ——— ؟

کہاں ——— ؟

بہت دُور ——— ! انجم رونے لگا۔ نہ جانے منظر کو دیکھتے ہی اس کے آنسو کیوں نکل پڑتے تھے۔؟

منظر سے انکار نہیں ہو سکا۔!

انجم اُسے اپنے باغ میں لے گیا۔!

کیا کہنا چاہتے ہو — ؟

منظر میں گھر چھوڑ آیا ہوں۔!

گھر چھوڑ آئے ہو ——— ؟ اس نے سخت تعجب سے کہا۔

تمھیں دولت سے نفرت ہے — نا ؟

وہ سکتے میں آگئی — !

میں نے تمھارے لئے گھر بار رُوپیہ پیسہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے — ؟

منظر بُت بن گئی تھی — !

اب تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔؟

مجھے اعتراض ہے ـــــــ؟ منظر دل کا ماجرا سُننے کے بعد نکتہ چینی کرنے کی عادی تھی۔

انجم کھوسا گیا۔!

تم اپنی والدہ کو چھوڑ سکتے ہو۔ مَیں اپنی والدہ کو نہیں چھوڑ سکتی۔؟

صاف کہدو مجھ سے نفرت ہے۔؟

تمھیں کون سمجھائے؟ والدین کا دل دُکھا کر کوئی بھی سکھی نہیں رہ سکتا۔ پھر گھر سے نکل جانے کا نام محبت ہے نہ صرف محبت کو زندگی کہتے ہیں ـــــــ؟

کسی عنوان چین بھی ہوگا۔؟

میں کہتی ہوں آنکھیں نہ بند کرو۔ اپنے ارد گرد خوب اچھی طرح دیکھو۔؟

تم خودکشی کرا کر ہی دم لوگی۔؟ انجم نے ہارے ہوئے جوارے کی طرح کہا۔

منظر کی آنکھوں میں اندھیرا سا آگیا۔!

بہت دیر ہوگئی گھر چلنا چاہیئے۔؟

وہ چُپ چاپ ساتھ ہولیا۔! راستے میں نہ منظر نے بات کی نہ وہ کچھ بول سکا۔! لیکن جب بغیر کچھ کہے سُنے انجم رخصت ہونے لگا تو منظر سے نہ رہا گیا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

سیدھے گھر جا رہے ہو نا۔؟

تمھیں کیا ـــــــ؟

منظر پوری دل کشی کے ساتھ مُسکرا دی۔!

انجم کی آنکھوں میں جنون بھی تھا اور محبت بھی۔!

دیوانہ پن چھوڑ دو تو میری جان میں جان آئے۔؟

انجم کے اوسان درست ہو گئے۔!

میں نے بہت دُکھ پہنچایا ہے۔؟

منظر نیچی نگاہ کئے کھڑی تھی۔ آج پہلی مرتبہ مست مست شریر آنکھوں میں آنسو دیکھے گئے۔!

انجم نے تلملا کر اس کا چہرہ اونچا کر دیا۔!

اطمینان رکھو آئندہ تمہیں چھیڑنے کی کوشش نہیں کی جائے گی چاہے جان ہی پر کیوں نہ بن جائے۔

وہ چلا گیا۔ لیکن منظر بڑی دیر تک وہیں کھڑی رہی اور آنکھوں سے اشک جاری رہے۔

اُس دن کے بعد انجم کی زبان پر منظر کا نام نہیں آیا۔ ہرچند کہ اُسے بُھلانا آسان نہیں تھا لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ اُسے اپنی نہیں اُسی کی خوشی کے لئے بُھلا دیا جائے۔ پر محبت کی بھول بُھلیاں ہی کیا جو دل اور نگاہیں ہر لحظہ بھٹکتے نہ پھریں۔ یہ گمان ہوتا تھا جیسے انجم کے قبضہ میں آنسو بھی نہیں رہے ہیں۔ اور وہ رونے کی بجائے ہنسنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ زندگی کسی نہ کسی طرح گذارنی ہی پڑتی ہے۔ وہ بھی گذار رہا تھا۔

منظر کے چہرے پر بھی کبھی کبھی حیرانی برسنے لگی تھی اور اس کا دل بُرا بھلا کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ مطمئن تھی اور گاہے سرِ راہے انجم سے مُلاقات کے علاوہ اب آنسوؤں کی وہ ہولی تھی نہ آہن و آتش کا وہ کھیل۔ جسے کھیلے ہی بنتی تھی نہ چھوڑے ہی بنتی تھی۔ منظر کو

اطمینان ضرور حاصل تھا لیکن تازہ واقعات سے دِل میں ہلکی سی جو پھانس چُبھی تھی وہ نکلنے کا نام نہ لیتی تھی اور اکثر پچھلی راتوں کو کھٹک کھٹک کر نیند اُڑا لے جاتی تھی۔

ماں کی ممتا نے بچّے کی اُڑائی پریشانی دُور کرنے کے لئے جو بات سوچی تھی وہ دِل سے نکل ہونٹوں اور ہونٹوں سے نکل کوٹھوں چڑھ چکی تھی۔ اُن کے خیال میں دل کی بات پُورا ہونے کا وقت آگیا تھا۔ یہ خبر آس پاس رہنے والی بڑھیوں کے کانوں پڑی وہ پَر پُرزوں سے ہشیار ہوکر کھڑی ہوگئیں۔ چاروں طرف نگاہیں ڈالی جانے لگیں۔ تاک جھانک کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بڑی دیکھ بھال کے بعد ایک جگہ تجویز ہوئی۔ اونچا گھر تھا۔ بڑی ڈیوڑھی۔ کسی زمانے میں دروازے پر ہاتھی جھُومتے تھے۔ اب بھی موٹروں کا گھاٹا نہیں تھا۔ آپس میں صلاح مشورے ہوئے۔ دین لین کا اندازہ کیا گیا۔ انجم کی والدہ کے لئے منظر کی ماں سے زیادہ مشیر کون ہوسکتا تھا۔ وہی کارمختار قرار پائیں۔ سب کی رائے سے اَرچے پَرچے جاری ہوگئے۔ بہت سے دلوں کی میٹھی مُراد آئی۔ تھیلیوں کے مُنہ کھُل گئے۔

چاندنی رات تھی ٹھنڈی ہوا تھی اچھا سماں تھا۔ منظر اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی تاروں کی چمک اور فضا کی خنکی سے جی بہلا رہی تھی۔ ماں ابھی تک بڑی حویلی سے واپس نہیں آئی تھیں اور اُسے فکر تھا کہ آخر دوپہر سے اب تک کیا کر رہی ہیں۔؟ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی آگئیں۔

آج آپ کو اتنی دیر کیسے ہوگئی۔؟

انجم کی بات ٹھیر رہی ہے نا۔؟

منظر پر بجلی سی گری۔ تاہم اُس نے سنبھل کر پوچھا۔

کہاں ——؟

نواب ناصر جاہ کے ہاں ——!

وہ بھی دولت مند ہوں گے ——؟

کیوں نہیں۔ سُنا ہے لڑکی بہت خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے۔!

آگے نہ منظر نے کچھ پوچھا نہ ماں کے لئے کچھ بتانا ضروری تھا۔

انھیں دن بھر کی تکان تھی پڑتے ہی سو گئیں۔ البتہ منظر کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی اُسے بلاشبہ اس بات سے دُکھ پہنچا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ انجم ہی طرح اُس کی مالا جپتا رہے اسی کے گیت گاتا رہے۔ مگر تصویر کا دوسرا رُخ نظر میں آیا تو وہ ایک فاتح کی طرح تن کر بیٹھ گئی۔ اسی دن کے لئے دِل مسوس کر اُس نے انجم سے کنارا کیا تھا۔ منظر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے لمبی سی ایک آہ ضرور بھری لیکن آنکھیں بند کرنے کے بعد فوراً نیند آ گئی۔

انجم کو اچانک خبر ملی کہ منظر کی طبیعت ناساز ہے اور بُری طرح بخار میں پڑی ہوئی ہے اُس کے آنسو خون سے بدل چکے تھے۔ منظر بدل چکی تھی۔ زمانہ بدل چکا تھا۔ وہ خود بدل گیا تھا مگر محبت بھرا دل نہیں بدلا تھا۔ اُس سے بیٹھا نہ رہا جا سکا شام کو منظر کی والدہ جو نہی اُس کے ہاں آئیں وہ ہمت کر کے چل کھڑا ہوا۔

منظر پلنگ پر آنکھیں بند کئے لیٹی تھی جسم پر کمزوری کے آثار تھے۔ لیکن چہرے کے رنگ نے اُڑ کر اور بھی دل کشی کی شان اختیار کر لی تھی۔ آہٹ پا کر اُس نے آنکھیں کھولیں

اور انجم کو پہلے ہی جیسا انجم دیکھ کر بہت متعجب ہوئی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

کیسی طبیعت ہے ——— ؟

بخار ہے ——— ؟

انجم نے ماتھے پر ہاتھ رکھنا چاہا لیکن منظر نے ایسا نہیں کرنے دیا۔

یہ ہاتھ اب کسی اور کے لئے ہیں۔ ؟

انجم بے چین ہوگیا اور اُس نے بے چینی کے ساتھ زبردستی اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا مگر آنکھوں سے اشک جاری ہوئے بغیر نہ رہے۔ !

رونے کی اجازت ہے اس لئے کہ آنسو پونچھنے والی بہت جلد آرہی ہو۔ ؟

کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ؟ انجم نے حیران ہو کر پوچھا۔

تمھارے دل کی باتیں۔ سُنا ہے لڑکی حسین ہو۔ بڑا گھر ہے بڑی باتیں۔ ؟

ستم کے یہ نئے ڈھنگ نکالے ہیں۔ ؟

اب تھوڑی سمجھو گے۔ ؟

انجم سے ضبط نہ ہوسکا۔ بغیر کچھ کہے سُنے اُٹھ کر چلا گیا۔ راستے بھر اُسے منظر کے پاس جانے کا تاسف رہا۔

ایک دم انجم کے چلے جانے سے منظر کا دل بیٹھ گیا۔ اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی رہ گئی۔ لیکن جب ہوش آیا تو اُس نے چند آنسو بہا کر دل کا غبار دُور کر دیا۔ افسوس کے ساتھ اُسے خوشی بھی تھی کہ عُمر بھر کی جلن سے بچ گئی۔

دو روز بعد انجم کو والدہ کی تجویز معلوم کر کے جس قیامت سے دوچار ہونا پڑا۔ اُسے انجم کا ہی جی جانتا ہوگا۔ وہ گھبرا گیا اور اپنے گرد لوہے کا سا حصار دیکھکر اور بھی سہم گیا لیکن

اُس کے دل ودماغ میں منظر کی محبت نے جو روح پھونکی تھی۔ اُس کی موجودگی میں پاؤں لڑکھڑانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ انجم نے کمال دلیری سے کام لیا اور بلا سوچے سمجھے چچا زاد بڑی بہن کی معرفت شادی نہ کرنے کی اطلاع والدہ تک پہنچا دی۔ وہ یکبارگی سناٹے میں آگئیں اپنی بنی بنائی عمارت گرتی ہوئی دکھائی دی۔ کیا کیا امیدیں باندھی تھیں۔ کیا کیا کچھ سوچا تھا۔ انھیں رنج تھا۔ افسوس تھا۔ صدمہ تھا ایسا صدمہ، جو ہوش بجا نہیں رہنے دیتا۔ پھر بھی انھوں نے اپنی لیاقت کا اعلیٰ ثبوت دیا اور اس خبر کو عام نہیں ہونے دیا۔

انجم شادی سے انکار کرنے کے بعد اُس منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں آدمی خودکشی کر سکتا ہو نہ زندہ رہنا اُس کے بس کا روگ ہوتا ہے۔ ماں رنجیدہ، منظر برگشتہ۔ دل اپنے حال پر آپ گریاں۔ خدا جانے وہ جی کیوں کر رہا تھا اور کونسی طاقت اُسے اُٹھنے بیٹھنے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ یہ وہ دَور تھا کہ اُسے منظر کا خیال بھی نہیں رہا تھا غم اور حسرت کی ملی جلی بس ایک لہر تھی جس نے پُوری طرح بوکھلا کر دم لیا تھا۔

انجم کی والدہ اُن عالی دماغ خواتین میں سے تھیں کہ اگر سات بچے بھی اُن کی تربیت میں دے دئے جائیں تو سب کے سب آدمی بن کر نکلیں۔ بچّوں کو سدھانے سمجھانے، لکھانے پڑھانے اور اُن کی عادتوں کو سمجھنے کا اُنھیں وسیع تجربہ تھا اور ہر کام سوچ سمجھ کر کیا کرتی تھیں۔ انجم کے انکار سے جہاں اُن کے دل کو صدمہ ہوا۔ وہاں اُن کی نگاہ اُس کے دل کی گہرائیوں میں بھی پہنچنے لگی۔ اور چند روز کی خیال آرائی کے بعد انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انجم کو کسی لڑکی سے محبت ہے۔ اسی وجہ سے وہ شادی کرنے پر تیار نہیں ہے اور گم سُم رہتا ہے۔ اُن کی رائے میں وہ کالج کی کسی اَپ ٹو ڈیٹ لڑکی پر ریجھا ہوا تھا جس کی جھلک صبر و قرار نہیں لینے دیتی تھی۔ بظاہر

یہ رائے غلط نہیں کہی جاسکتی اس لئے کہ انجم خوش پوش ہنس مکھ اور زندہ دِل نوجوان تھا اور اُس کی نگاہ کسی نئے چہرے پر ہی ٹھیر سکتی تھی۔ کتنی ہی بار انھوں نے سوچا تھا لیکن اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اپنا وقار۔ بیٹے کا دل اور گھر بار کا بھرم رکھنا چاہتی تھیں اور کسی ایک شے کو بھی کھونے کے حق میں نہیں تھیں۔ آخر انھوں نے زمانے کے نشیب و فراز کو سامنے رکھکر یہ معاملہ انجم کی مرضی سے طے کرنیکا فیصلہ کرلیا۔ چونکہ بیٹے سے خود بات کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھیں اور منظر کی ماں سے زیادہ کسی پر اعتماد نہیں تھا اس لئے وہی گفت و شنید کے لئے نامزد ہوئیں۔

منظر نے ایک دفعہ بھول کر پھر انجم کو یاد نہیں کیا۔ اس کے ہاں جانا۔ اس کا نام لینا یہ تو بڑی باتیں ہیں کبھی اُس کا خیال بھی آجاتا تو مُنہ پھیر لیا کرتی۔ اُس کے نزدیک وہ موجودہ زمانے کا ایک نوجوان تھا اور حسین تیتریوں کے پیچھے پیچھے پھرنا۔ ایک پھول سونگھنے کے بعد دوسرے کی تلاش کرنا اُس کے پروگرام میں شامل تھا۔ وہ آج بھی رات کے وقت پلنگ پر بیٹھی اپنی والدہ کا انتظار کررہی تھی۔ اُسے غصّہ بھی تھا کہ اماں جان خواہ مخواہ بڑی حویلی میں جاکر اپنا وقت ضائع کیوں کرتی ہیں۔ خاصی دیر کے بعد وہ آئیں تو منظر نے جل کر کہا۔

آج تو بڑی دیر لگادی۔ ایسا بھی کیا کام ہے۔ شادی کہیں ہو مصیبت کہیں بھری جائے۔ ؟

کیسی شادی وہاں تو غم پھیلا ہوا ہے۔ ؟

خیر تو ہے ——؟

کیا بتاؤں۔ لڑکا شادی کرنے پر رضامند نہیں ہے۔ ؟

جیسے سچ مچ زلزلہ آگیا۔ منظر لرز لرز گئی۔ اور اُسے ہاتھ پیروں کا دم نکلتا ہوا معلوم ہوا۔! ماں کہے گئیں :۔

کیسا زمانہ ہے۔ لڑکی چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ پڑھی لکھی۔ سلیقہ مند۔ باشعور پیسے والی۔ مگر لڑکے کا مزاج ہی سامان میں نہیں آتا۔؟

منظر کی زبان سے ایک حرف نہ نکلا۔ بے غل وغش پڑی رہی۔ تمام شب تڑپ تڑپ کر آنکھوں میں کٹی۔ اور انجم کی معصوم تصویر دل پر ہتھوڑے بجاتی رہی۔ وہ تھی۔ آہیں تھیں اور آنسوؤں کا سیلاب۔

انجم صبح کی نماز پڑھنے کے بعد اوپر کمرے میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ جب سے اس کا دماغ پلٹا تھا وہ محبت کی یاد تازہ رکھنے کیلئے اوپر ہی کے کمرے میں آگیا تھا۔ اور ماں نے بھی موقع محل کے لحاظ سے مداخلت نہیں کی تھی۔ پڑھتے پڑھتے انجم نے بیدلی سے اخبار میز پر رکھدیا۔ یکایک کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ انجم نے نگاہ اونچی کی۔ تو منظر کو کھڑے ہوئے پایا۔ مگر وہ بے حد مغموم۔ پریشان اور مضمحل نظر آتی تھی۔

منظر ——؟ انجم کو آہ بھر کر بات کرنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

اُس نے کانپتی ہوئی نظر سے انجم کو دیکھا —— جیسے کوئی گناہ بردوش پجارن دیوتا کو دیکھتی ہے۔

آج کیسے راستہ بھول گئیں ——؟

منظر کی نگاہ زمین پر جم گئی اور اس نے آہستہ سے کہا۔

معافی مانگنے ——؟

وہ کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ منظر نے جھک کر اُس کے پاؤں چھو لئے ۔!

انجم نے اُس کی باہیں پکڑ لیں ۔ اور جب منظر نے محبت بھری نظر سے دیکھا تو انجم نے بے ساختہ کلیجے سے لگا لیا ۔ منظر تو انجم کی جان تھی اور اُس نے جان ہی کی بازی لگا کر اُسے حاصل کیا تھا ۔

منظر جانے لگی تو اُس نے ٹھیک پہلے کی طرح اُس کا راستہ روک لیا ۔

وہ شرما گئی ۔ اُس کے شرمانے کا انداز بہت ہی پیارا تھا ۔ اور اُس پر سچ مچ انجم کا دم نکلتا تھا ۔!

انجم نے پیار سے ہاتھ پکڑ کر اپنی انگوٹھی اُس کی چھنگلی میں پہنا دی ۔!

منظر اور بھی شرما گئی ۔!

انجم نے چہرہ اونچا کر دیا ۔!

میری دُلہن کو دیکھو گی ؟

منظر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا ۔!

انجم اُسے زینے تک پہنچانے گیا ۔ اور وہ نیچے اُترنے لگی تو اُسے یہ معلوم ہوا جیسے منظر کے پاؤں سیڑھیوں پر نہیں اُس کے دل پر پڑ رہے ہیں ۔

منظر کو چھوڑ کر انجم اپنے کمرے میں آیا تو اُسے دو منٹ کھڑا رہنا دوبھر ہو گیا ۔ میز پر ۔ بچھونے پر ۔ کتابوں اُدر دیواروں پر خاک جمی ہوئی تھی ۔ وہ بَولا کر نیچے اُتر آیا ۔

یہاں والدہ اور منظر کی ماں بیٹھی ہوئی آپس میں باتیں کر رہی تھیں انجم کو دیکھ کر چپ ہو گئیں ۔ اُس نے دونوں کو جھک کر سلام کیا اور آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں چلا گیا ۔ بڑی بیگم کے اشارے پر منظر کی ماں اُس کے پیچھے ہو لیں ۔ انجم ایک خوشی کے عالم میں بیٹھا

ٹرنک کھول رہا تھا اور ساتھ ساتھ کچھ شعر بھی گنگنا رہا تھا۔

انجم میاں ——— ؟ منظر کی ماں نے آواز دی۔

جی اماں ——— ؟ انجم حیرانگی اور نرمی کے ساتھ بولا۔

کوئی ضروری کام کر رہے ہو ——— ؟

جی نہیں۔ ذرا کپڑے نکال رہا تھا۔ آیئے تشریف رکھئے۔ ؟

ایک بات کرنی ہے۔ انھوں نے پلنگ پر ٹک کر کہا۔

فرمائیے۔ ! انجم سٹپٹا گیا۔ کچھ ہی دیر پہلے منظر رخصت ہوئی تھی۔

اُنھوں نے انجم کے چہرے پر نظر ڈالی۔

انجم کا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا اوپر رہ گیا۔

شادی سے انکار کیوں ہے۔ ؟

انجم خاموش رہا۔ لیکن دل کا خوف جاتا رہا تھا۔

بتانے میں کیا ہرج ہے۔ ؟

بات یہ ہے آج کل طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ——— !

دیکھو میاں۔ بڑی بیگم فرماتی ہیں۔ درصل انکار کی وجہ طبیعت کی ناسازی ہے تو کچھ عرصے کے لئے شادی کا مسئلہ ملتوی کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو بھی ہمیں اعتراض نہ ہوگا۔ تم ماشاءاللہ سمجھ دار ہو سعادت مند ہو اور ہمیں اعتماد ہے کہ اپنا فیصلہ ہم سے بھی زیادہ ہوشیاری اور انصاف سے کر سکو گے۔

انجم کی آنکھیں پُر نم ہوگئیں یہ دل سے اُمڈی ہوئی موتی کی لڑیاں تھیں۔ اُسے والدہ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی دکھائی دیں۔

وہ غور سے انجم کی طرف اور انجم سامنے روشندان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سمجھ گئے ——— ؟

جی ——— ؟

پھر انھیں کیا جواب دیا جائے۔ ؟

انجم پھر دہم رہ گیا۔ پریشانی سی پریشانی تھی۔ اُن سے کیا کہا جائے۔ کیوں کر کہا جائے۔

دِل کا معاملہ اور واقعات عجیب۔ !

اس میں شرمانے کی کیا بات ہو۔ ؟

انجم سے بولا نہ گیا۔ !

کالج کی کوئی لڑکی نگاہ میں ہے۔ ؟

انجم کو چُپ لگ گئی تھی۔ !

کوئی اِس سے بھی زیادہ اونچا رشتہ چاہتے ہو۔ ؟

بچی اماں رئیس نے کبھی امارت اور غریبی میں امتیاز نہیں رکھا۔ ؟

جیتے رہو بیٹا آخر بڑے باپ کے بڑے بیٹے ہو۔ ؟

انجم کی نگاہیں پھر جُھک گئیں۔ !

بڑی بیگم سے جاکر کیا کہوں۔ ؟

اُن سے فرمادیجئے کہ دو چار دن میں عرض کروں گا۔ ؟

کوئی لڑکی خیال میں ہے نا۔ ؟ انھوں نے کُھل کر پوچھا۔ اِس گھر اور گھر والوں سے

اُنھیں اپنوں سے زیادہ محبّت تھی۔

انجم شرما گیا۔ !

وہ خوشی خوشی چلی گئیں۔ بڑی بیگم نہال نہال تھیں۔ انجم کپڑے پہن کر باہر نکلا تو ماں کی شادمانی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ اور اُن کی میٹھی نگاہوں نے دور ہی سے انجم کی پیشانی چوم لی۔

وہ اپنی منظر کے پاس جا رہا تھا۔ دل میں محبت تھی۔ آنکھوں میں شوق۔ تصور میں من کی مورت۔ منظر نے ابھی ابھی لباس تبدیل کیا تھا۔ اُس کے پاس تزئین کے سامان نہیں تھے لیکن حسن نے خود سولہ سنگھار کئے تھے اور چہرے کی بہار صبح سے زیادہ جمیل منظر پیش کر رہی تھی۔

منظر ——— ؟

وہ اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ !

انجم نے پیار سے دوپٹہ کا آنچل تھوڑا سا نیچے کھسکا کر گھونگٹ نکال دیا۔ !

اور منظر بالکل نئی دُلہنوں کی طرح شرما گئی۔ !

انجم پلنگ پر بیٹھ گیا اور اُسے بھی اپنے پاس بٹھالیا۔ !

میرے ساتھ رہو گی ——— ؟

منظر چپکی بیٹھی رہی ——— !

رہو گی نا ——— ؟

منظر کے چہرے پر حجاب اور تبسم دونوں رقص کر گئے۔ اور اس نے آہستہ سے اپنا سر اُس کے شانے پر رکھدیا۔

بڑی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ اور انجم خوشی کی بہت سی لہریں دل میں لے کر واپس آیا۔

وہ تمام دن مسرت کے کھیل کھلونوں اور سکون کے چپے بٹوں سے کھیلتا رہا۔ محبت کے تاج محل بنا کیے۔ اُمیدوں کے نئے نئے گھروندے تیار ہوتے رہے۔ آج دنیا اسکی تھی اور اُسے در و دیوار سے زندگی برستی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ خلافِ توقع کامرانی نے دِل کے شگوفے کِھلا دئے تھے۔ اُس نے دن جوں توں کر کے کاٹ ہی لیا۔ لیکن شام کو بتیاں جلتے ہی اس کے دل کی ساری بتیاں بھی روشن ہو گئیں وہ بیتاب ہو کر کھڑا ہو گیا اور منظر کو اپنے ساتھ لے آیا۔

اوپر کے کمرے میں دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں جیا جا رہا تھا۔

ایک بات پوچھیں ——؟

پوچھیئے ——!

اتنے دنوں مجھے پریشان کیوں رکھا۔؟ انجم نے جذبات کی بلندی کے ساتھ پوچھا۔

وہ جواب نہیں دے سکی منظر بلبل تھی اور بلبل بھی ہزار داستاں۔ لیکن اس دنیا کا اصول یہی رہا ہے کہ دل میں محبت کارفرما ہو تو پھر زبان کام نہیں دیا کرتی۔؟

بتاؤ ——؟

کسوٹی پر کسنے کے لئے۔ —؟

اچھی طرح دیکھ لیا ہے ——؟

منظر لجیا گئی ——!

سچ بتانا کیسا پایا —— —؟

اشرفی کا سونا ——؟

اور تم ——— ؟

میں کیا جانوں ——— ؟ بات کہنے کے ساتھ ساتھ کانوں کے آویزے بھی جھوم گئے۔!

ہیرا ——— ؟ جس کی زینت سکون دیتی ہے اور کنی جان لیتی ہے۔؟

دونوں بچوں کی طرح ہنس دئے۔

بڑی بیگم کسی وجہ سے صحن میں آئیں تو انھیں اوپر کے کمرے میں روشنی دکھائی دی' ذ سوچ میں پڑ گئیں کہ سب باتیں مان لینے پر بھی انجم اوپر کے کمرے میں کیوں ہو وہ صائب رائے سلجھی ہوئی سنجیدہ خاتون تھیں اور تیسرے درجہ کی باتوں میں پڑنا اُن کا منصب نہیں تھا۔ پھر بھی بچے کی محبّت۔ نازک حالات کا احساس۔ بے محابا اوپر چلی گئیں۔ کمرہ بند تھا اور اندر سے ایک نہیں دو ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ٹھٹکیں اور ٹھٹک کر گوش بر آواز ہوگئیں۔

چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں تو ہونے دو۔ مَیں تمھیں چھوڑ کر تھوڑی جاؤں گا۔؟

سچ ——— ؟

اور کیا جھوٹ۔ ؟ امّاں جان سے دو چار دن کا وعدہ ہے۔ سو اُن کی خدمت میں عرض کر دیا جائے گا۔ ؟

اُنھیں اعتراض تو نہیں ہو گا۔؟

وہ میری والدہ ہیں۔! جانتی ہو۔ ؟

انجم کی آواز تو پہچانتی تھیں۔ دوسری آواز بھی نئی نہیں تھی۔ مگر وثوق کے ساتھ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کون بول رہا ہے۔ وہ دبے دبے پاؤں آگے بڑھیں اور شیشے

میں سے اندر دیکھا۔ انجم اور منظر بیٹھے تھے۔ وہ حیران ہوئیں اور اُلٹے پیروں واپس چلی آئیں
دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ اِسی عالم میں پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ سارا نقشہ اُن کی آنکھوں میں
پھر گیا تھا۔ دو منٹ کے بعد اطمینان سا ہوا۔ آنکھیں چمکنے لگیں اور اُن کی نظر دیوار پر لٹکی
ہوئی ایک تصویر پر جم گئی۔ یہ ایک خوشنما قلمی تصویر تھی جس میں اُن کے مرحوم شوہر اور منظر
کے والد منصرم صاحب پاس پاس بیٹھے تھے۔ بڑی بیگم کو دونوں متین چہروں پر مسکراہٹ
کھیلتی ہوئی نظر آئی۔ وہ خاص جذبے کے ماتحت اُٹھ کر صحن میں ٹہلنے لگیں۔ کچھ دیر بعد
منظر ہولے ہولے نیچے اُتری تو اُسے بیچ صحن میں بڑی بیگم دکھائی دیں۔ وہ سٹ پٹا گئی
مگر فوراً جھک کر سلام کیا۔ اُنھوں نے سر پر ہاتھ رکھدیا اور اپنے ساتھ دالان میں لے گئیں
منظر بارہا اُن کی نگاہ میں رہی تھی مگر اس نگاہ سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب جو اُس پر نگاہ پڑی
تو منظر کے چہرے پر معصومیت۔ سادگی۔ رعنائی اور وہ شے نظر آئی جسے دیکھتے ہی ہر کنوارے
نوجوان کی ماں کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔

منظر حیران تھی۔ اوسان اُڑے جاتے تھے۔ اتفاق کی بات کہ اس کی والدہ بھی
آگئیں۔ اُنھیں دیکھکر بڑی بیگم اندر چلی گئیں۔

بلا پوچھے گچھے یہاں کیسے چلی آئی ۔ اُنھوں نے منظر سے پوچھا۔

مَیں نے بُلایا تھا بہن۔ بڑی بیگم اندر سے مُٹھی میں کچھ دبائے ہوئے نکلیں " کیا یہ
میری بچی نہیں ہے " اُن کی زبان میں بلا کا لوچ تھا۔

ہے کیوں نہیں ۔ ؟ منظر کی ماں نے زندہ لب و لہجے میں کہا۔

اُنھوں نے محبت ...سے منظر کا جُھکا ہوا چہرہ اونچا کیا۔ اور مصری کا ٹکڑا منہ دیکر موتیوں کا
خوبصورت ہار گلے میں پہنا دیا۔ !

منظر کی ماں ششدر رہ گئیں۔ اُنھیں یہ سب کچھ خواب معلوم ہو رہا تھا۔!
بہن میں بہت دنوں سے غور کر رہی تھی کہ دونوں گھروں کو کس طرح ایک کیا جائے۔
آخر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے یہ خوشگوار موقع دے ہی دیا۔؟
آپ کیا فرما رہی ہیں۔ کہاں آپ کہاں میں۔؟؟؟
بڑی بیگم نے کچھ جواب دینے کی بجائے اُسی تصویر کی طرف اشارہ کر دیا۔!
منظر کی ماں نے دیکھا۔ نگاہیں خود بخود نیچی ہو گئیں۔؟
جو آپ کی مرضی۔؟ خدا آپ کو خوش رکھے۔!
انجم کو بھی بُلایا گیا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ یہاں کیا کیا کچھ ہو چکا ہے۔ ڈرتے ڈرتے آیا۔
آہستہ آہستہ دالان میں گیا۔ منظر، اُس کی والدہ۔ بڑی بیگم سب موجود تھیں وہ بھی حیران ہو گیا۔
انجم ——— ؟ بڑی بیگم نے آواز دی۔
وہ اُن کے قدموں میں گر پڑا۔!
ماں نے بچے کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور گلے سے لگا لیا۔!
انجم کی والدہ واقعی انجم کی والدہ اور بڑی بیگم تھیں۔! +

جیسے صبح کا سُہانا وقت۔ صحنِ چمن۔ ایک شبنم آلود سرسبز ٹہنی۔ نسیم کی گود میں دو خوشنما چنبیلی کے پھُول۔ اُن کی بہار۔ تازگی۔ جمال اور البیلاپن ـــــــ ویسے ہی اپنے والدین کی مرادوں کے سیمیں ہار میں وہ دو موتی کی لڑیاں۔ دل آویز۔ دل کش۔ دل افروز ـــــــ !

عذرا اور فاخرہ ـــــــ ؟ نورانی پیکر۔ لطیف مجسّمے۔ دو جوانی میں شرالور تاروں سے کھیلنے والی برابر کی بہنیں۔ کچھ یوں ہی سی چھُٹائی بڑائی۔ ایک کو چھُپاؤ۔ دوسری کو نکالو۔ دونوں سیم تن۔ صمد نگاہ۔ شیریں سخن۔ اِس درجہ معصُوم تصاویر کہ نظر حیران اور نظارہ

پریشان رہ جائے۔ فرق اتنا تھا کہ بڑی کی مانگ ہر وقت پھولوں سے بھری رہتی تھی۔ کلائیوں میں دست بند نظر آتے تھے ناک میں نازک سی کیل۔ شباب کیساتھ چہرے سے سہاگ بھی ٹپکتا تھا۔ وہ اٹھارویں بہار میں آتے ہی رضا کی للچائی ہوئی نگاہ میں اس طرح سما گئی تھی کہ اس نے دولت پھینک کر آسانی کے ساتھ اس مورتی کو جلد سے جلد حاصل کرلیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے پسندیدہ کھلونا بھاری قیمت پر مارکیٹ سے حاصل کرلیا جاتا ہے لیکن فاخرہ کی پتلی پتلی سبک سی ناک میں ابھی تک باریک تنکا دکھائی دیتا تھا اور بھولے مکھڑے کی رعنائی ارمان بھرے دل کی قسم کھاکر دوشیزگی کا اعلان کر رہی تھی۔

ہاکی ٹورنمنٹ پوری شان و شوکت کے ساتھ جاری تھا۔ دُور دُور سے ٹیمیں آئی تھیں روزانہ میچ ہوا کرتے تھے۔ پبلک کا اشتیاق اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ سینماؤں میں پبلک کی کمی محسوس ہونے لگی تھی آج ڈیرہ دون اور شہر کے منتخب کھلاڑیوں کی ٹیم کا مقابلہ تھا۔ اور میچ سے تقریباً سارا شہر دلچسپی لے رہا تھا۔ دفتروں۔ کالجوں اور اسکولوں میں چھٹی ہوچکی تھی اور تین بجے ہی سے گراؤنڈ کے گرداگرد لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آنے لگا تھا! ادھر پبلک ٹوٹے پڑ رہی تھی اور لوگوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں کھنچی چلی آرہی تھیں۔ اِدھر شہر کی ٹیم میں نہ ختم ہونے والی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ رضا کا دعویٰ تھا کہ کلب کے سکریٹری کی حیثیت سے گیارھویں کھلاڑی کی کمی وہ اپنی مرضی سے پوری کرے گا۔ ممبران کی اکثریت کو اِس دعوے کی تصدیق سے انکار تھا۔ اُن کی رائے میں تین ناموں میں سے گیارھواں نام چُننا کیپٹن کا حق تھا۔ اور سکریٹری کو محض اس کے تموّل کی وجہ سے یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ رضا کے دوست کلب پر اس کے احسان جتاتے تھے اور معمولی سی بات پر ناراضگی

مول لینے کا مشورہ نہیں دیتے تھے۔ کیپٹن شہریار کلب کو رضا کے پیروں میں ڈالنے کے لئے
تیار نہیں تھا۔ اور سرمایہ کا نام آتے ہی اکثر ممبران کی تیوریاں بھی بدل چکی تھیں۔ آخر بڑی کج بحثی
کے بعد رائے شماری ہوئی اور نتیجہ کے طور پر رضا کو ہارجانا پڑا۔ رضا نے غالباً زندگی میں
پہلی مرتبہ شکست کھائی تھی۔ اور اس کے سرمایہ دارانہ غرور کو ٹھیس لگنی ضروری تھی۔

رضا اور شہریار غیر نہیں تھے۔ بہت ہی قریبی رشتہ دار کلاس فیلو اور دیرینہ ساتھی لیکن
عجیب بات یہ تھی کہ دونوں میں کبھی نہیں بنی تھی۔ اور قربت کے باوجود اختلاف کی خلیج موجود
تھی۔ رضا کے پاس زیادہ دولت بھی تھی اثر اور اقتدار بھی تھا۔ اور اسی باعث اپنے آپ کو
بلند رکھنا پسند کرتا تھا۔ شہریار کم مایہ ضرور تھا مگر وضعداری میں کسی طرح پیچھے رہنا نہیں چاہتا
تھا۔ دونوں میں کشمکش تھی۔ دلوں میں فرق تھا۔ راہیں جدا تھیں۔ مزاج جُدا تھے۔ رضا اعلیٰ درجہ
کا جاہ پرست آرام طلب اور عیش پسند تھا۔ دولت کے بل پر سب کو ناچ نچانا اور بڑائی کے
ساتھ مُسکرانا اس کا شیوہ تھا۔ شہریار بالکل اُس کی ضد متین طبیعت۔ خوش مزاجی۔ میٹھے
بول میٹھی زبان۔ دولت بھی خاصی تھی۔ بزرگوں نے عزّت بھی کم نہیں چھوڑی تھی۔ مگر
انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی صاف دکھائی دیتی تھی۔

ٹیم وقتِ مقررہ سے پہلے گیلری میں پہنچ گئی۔ رضا اور شہریار آمنے سامنے بیٹھے
ہوئے تھے۔ اور ان کے ہواخواہ بھی حاضر تھے۔ اِتفاق کی بات کہ سیدھی سیدھی باتوں میں
اشارۃً کوئی سخن گسترانہ بات بھی آگئی۔ دل پہلے ہی بگڑے ہوئے تھے نوک جھونک ہو کر
رہی۔ شہریار اس وقت لڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بادلِ نخواستہ اُٹھ کر باہر آگیا۔ اور خراماں
خراماں وہاں پہنچ گیا جہاں وہ رنجیدہ نہیں ہنسی خوشی جانا چاہتا تھا۔ مگر سیٹیں خالی دیکھ کر
وہ پریشان سا ہوا۔ تاہم وہیں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی آگئی۔ فاخرہ کو دیکھ کر وہ

جھوم گیا۔ اور شہریار کو دیکھکر وہ بھی مسرور ہو گئی۔

اتنی دیر ——— ؟

آپا جان کپڑے بدل رہی تھیں ——— !

وہ ہیں کہاں ——— ؟

ابھی آتی ہیں ایک سہیلی کو لینے گئی ہیں۔ !

کوئی تازہ خبر ——— ؟

دُو دِن کہاں رہے ——— ؟

کیا بتاؤں فاخرہ۔ رضا بھائی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ہر بات میں لڑائی۔ ؟

خدا جانے انھیں بھوت کیوں سوار رہتا ہے۔ ؟

بھُوت ! مجھے تو وہ خود ہی بھُوت معلوم ہوتے ہیں۔ ؟

فاخرہ مُسکرانے لگی۔ !

بتاؤ آج کون جیتے گا ——— ؟ شہریار نے بچّوں کی طرح پوچھا۔

ہم ——— ؟

شہریار انہی اداؤں پر جی رہا تھا۔ !

سچ سچ تم چاہتی ہو کہ ہم جیتیں ۔ ؟

کیوں نہیں ——— ؟ وہ ترو تازہ لہجہ میں بولی۔

ایک کام کرو گی ——— ؟

ضرور ——— ؟

اپنا رومال میری کلائی پر باندھ دو۔ ؟

وہ شرما گئی۔ فاخرہ جب ادائے خاص سے شرماتی تھی تو شہر یار تو شہر یار فطرت کو بھی پیار آجاتا تھا۔!

نہیں باندھتیں۔ اچھا ہو گا ہم ہار جائیں گے۔؟

تم کیوں ہارنے لگے۔؟ فاخرہ نے اِس شان سے کہا جیسے وہ بے چین ہو گئی ہو۔

اِسی لئے نا کہ تم یہاں موجود ہو۔؟

فاخرہ نے کچھ کہے بغیر اُس کا ہاتھ تھام لیا اور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کلائی پر رومال باندھنے لگی۔!

وہ رومال باندھ رہی تھی اور شہر یار کی نظر بالوں کی طرح اُس کی مانگ پر جم گئی تھی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ من کے موتیوں سے افشاں چُن کر ہی رہے گا۔!

رومال باندھنے کے بعد اس نے نگاہ اٹھا کر شہر یار کو بھولپن سے دیکھا جیسے وہ بلائیں لے رہی تھی

میچ ختم ہونے کے بعد یہیں ملو گی۔؟

وہ جواب دینے نہیں پائی تھی کہ عذرا اُس کی ایک سہیلی اور رضا آگئے۔ شہر یار گھبرایا اور عذرا سے چند رسمی باتیں کر کے چلا گیا۔

رضا نے کبھی بیوی کی طرف دیکھا تھا نہ خسر اور خوش دامن کی طرف۔ پھر سالی کا خیال کیسا؟ اُسے اپنی دنیا۔ دوست اور رنگین محفلوں ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ مگر آج دل پر گھن کی چوٹ لگی تھی اور ہارنے کی ندامت نے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ شہر یار کو بیں دینا اُس کے پروگرام میں شامل ہو چکا تھا۔ اُس نے فاخرہ پر ایک جچی ہوئی نظر ڈالی۔ بہت سی لڑکیوں کو دولت کے جھولے میں جُھلا چکا تھا۔ ایک ہی نگاہ میں

ناڑ گیا کہ محبت ہی نہیں والہانہ محبت کار فرما ہے۔ رضا سب کچھ بھول گیا تھا۔ اور صرف اس حقیقت کو سامنے رکھ کر سوچنا شروع کر دیا تھا۔

میچ شروع ہو گیا۔ ہزار ہا تماشائیوں کی نظریں کھیل اور کھلاڑیوں کے ساتھ گھومنے لگیں جہاں گیند جاتی تھی وہیں نگاہیں جاتی تھیں۔ ذرا ذرا سی دیر میں تالیاں بجتیں۔ میدان گونج اٹھتا خوشی کے ترانے بلند ہو جاتے۔ لوگ سب کھلاڑیوں کا کھیل دیکھ رہے تھے۔ ان کا تمام جسم متحرک تھا۔ بعض اوقات وہ اپنے آپ کو میدان ہی میں تصوّر کر لیتے اور وہی کچھ کر گذرتے جو کھیلنے والے کو کرنا چاہیئے تھا۔ واہ واہ کا ایک شور تھا جو کان پڑی آواز نہیں آنے دیتا تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ برابر والے کو بے طرح ہنستے۔ اُچھلتے اور شور مچاتے دیکھ کر ہر شخص متعجب ہوتا تھا۔ لیکن کسی خاص منظر پر وہ بھی یونہی کرنے لگتا تھا۔ دیکھنے والوں میں ایک فاخرہ تھی جو بُت بنی ہوئی صرف اپنے کھلاڑی کو دیکھ رہی تھی۔ اُسے گیند۔ ہاکی۔ میدان۔ ریفری اور بقیہ اکیس کھیلنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کھلاڑیوں میں صرف شہر یار ایسا کھلاڑی تھا جو اپنے لئے نہیں کسی اور کے لئے کھیل رہا تھا۔ اور اس ہمہ گیری کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ میدان میں وہی وہ نظر آتا تھا۔ شہر یار ٹیم کا کیپٹن بھی تھا اور بانکا کھلاڑی بھی۔ مگر ناظرین کا بیان تھا کہ اس قدر چاؤ اور جی جان کے ساتھ وہ کبھی نہیں کھیلا تھا۔ اُسے آس پاس والوں کا غم تھا نہ ہار جیت کی پروا۔ وہ تو یہ سمجھ کر کھیل رہا تھا کہ اُس کی فاخرہ یہاں رونق افروز ہے۔

ہاف ٹائم تک دونوں ٹیموں کا پلہ برابر رہا۔ مخالف ٹیم بھی جم کر کھیلی اور ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن شہر یار اس وقفے میں فاخرہ کی مست نظر سے جو نشہ سا لیکر دوبارہ میدان میں گیا تو دس ہی منٹ میں ڈیرہ دون پر ایک گول ہو چکا تھا۔ اس اتفاق نے کھیل کو اور بھی چمکا دیا۔ ہر کھلاڑی بجلی کی طرح کام کر رہا تھا۔ اتنی کشمکش ہوئی کہ تماشائیوں کو لطف آگیا۔ اسی کھینچ تان میں

ڈیرہ دون پر ایک اور یورش ہوئی اور اُسے مجبُوراً کامیابی کی اُمید چھوڑ دینی پڑی۔

شہریار کو مجمع نے سر پر رکھ لیا۔ خوشی کے نعرے۔ پھُولوں کے ہار۔ کمر پر محبت سے پڑنے والی تھپکیاں۔ رضا کے چہرے پر شکست آلُود خاموشی تھی۔ عذرا کے ہونٹوں پر گہرا تبسم۔ اور فاخرہ کا تن مَن خوشی کے مارے ناچ رہا تھا۔ سب لوگ شہریار کا نام زبان پر لئے ہوئے واپس ہوئے اور فاخرہ ہمہ تن شہریار کو نگاہوں میں لئے ہوئے۔

اُسے شہریار کی فتح میں پر لگے ہوئے معلوم ہوئے اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی کہ اُس کھیل میں بھی اُس کو فروغ حاصل نہ ہو جسے زندگی کا کھیل کہا جاتا ہے۔ اِس خیال نے فاخرہ کے اچھُوتے دل میں سنسنی پیدا کر دی۔ اور شام کو جب اُس سے مُلاقات ہوئی۔ تو بات چیت میں نمایاں تبدیلی تھی۔

دونوں پاس پاس کھڑے تھے۔ دلوں میں محبت تھی۔ آنکھوں میں اشتیاق اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اِن میں ناز فرما کون ہے اور نیاز مند کون۔ پہلے کھیل کی باتیں ہوئیں پھر امنگیں سامنے آئیں۔ کھِلے ہوئے چہرے یکایک متین ہو گئے۔ زبانیں لڑکھڑا گئیں۔ اور دل پہلو میں دھڑکنیں بن کر رہ گئے۔

تمہارا کیا خیال ہے۔؟

فاخرہ شرما گئی۔!

شہریار نے محبت سے ہاتھ پکڑ لیا۔!

خدا جانے دل کیوں بیٹھا جاتا ہے۔؟

جی کیوں تھوڑا کرتے ہو۔؟

شہریار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔!

فاخرہ نے گھبرا کر نگاہ اُٹھائی اور دوپٹے کے آنچل سے اُس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ کون سے دل سے شہریار کو اشکبار دیکھتی۔

اور جو انھوں نے انکار کر دیا ــــــ؟ شہریار نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

ایک بار وہ بھی وہم رہ گئی۔!

کہو تو سہی۔ امّی جان ہمیشہ تمھاری تعریف کرتی ہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ...... ؟

فاخرہ کو حجاب آگیا۔!

خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اس کے جذبات میں طوفان تھا۔

شہریار کا پیام پوری شان سے آچکا تھا۔ اور فاخرہ کے گھر میں اس پر قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ لڑکے میں کوئی خامی نہیں تھی۔ اچھی شکل صورت۔ اچھے اطوار۔ اچھا اخلاق۔ اچھا گھر۔ سوال صرف یہ تھا کہ بڑی لڑکی کے شوہر سے حیثیت کم تھی۔ اور خاندان کے بعض نخوت پسند افراد چُپ چُپ دکھائی دیتے تھے۔ فاخرہ کے والد بھی خاموش ہی تھے لیکن فاخرہ کی امّی شہریار کو پسند فرماتی تھیں اور معقول طبیعت والے عزیز بھی اُن کے خیال میں اس سے اچھا بر ملنا مشکل تھا۔ رفتہ رفتہ سب متاثر ہوتے ہو گئے۔ اور یہ متفقہ فیصلہ ہو گیا کہ ہفتے عشرے میں رشتہ منظور کر لیا جائے گا۔

رضا کو جب اس شگوفے کی خبر ہوئی تو وہ پنجے جھاڑ کر لپٹ گیا اور شہریار کی مخالفت میں آسمان و زمین ایک کر دئے۔ اُس کے چال چلن پر نکتہ چینی کی گئی۔ جھوٹی سچی کہانیاں گھڑی گئیں۔ شیطان طوفان جوڑے گئے۔ پھر ایک نہیں دو نہیں پُورے دس آدمی شہادت دینے کو تیار تھے۔ کہ شہریار کے پاس ایک اینگلو انڈین لڑکی موجود ہے اور اس شادی کا مقصد یہ ہو گا۔

کہ فاخرہ کی جان کو جھور الگ جائے۔ اوّل اوّل تو گھر والے چوکنے ہوئے۔ مگر رضا کو رضا کے شیر اِ
کباب کو بھی جانتے تھے۔ اندھا دُھن فیصلہ کرنے کی بجائے چھان بین کی گئی اور دو چار ہی دن
میں اصلیت کھُل گئی۔ رضا نے اپنی دانست میں بڑی ضرب لگائی تھی مگر تقدیر کی خوبی نے
اُسے پھول کی پنکھڑی بنا دیا۔ اور شہر یار کی وقعت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ رضا نے صورت
حال کو شر بر نگاہ سے دیکھا اور قطعاً حوصلہ نہ ہارتے ہوئے ایک اور فتنہ کھڑا کر دیا۔ روزانہ اونچے
اونچے لوگوں کے پیام آنے لگے۔ کوئی جج تھا۔ کوئی بیرسٹر۔ کوئی سیٹھ تھا۔ کوئی سوداگر۔ اصل نقل
کی بھی قید نہیں تھی۔ بس بات اُڑانی منظور تھی اور اسی وجہ سے اُن کی موزونیت پر بہنوئی کے
رُوپ میں تبصرہ کیا جا رہا تھا اور نام پکڑ پکڑ کر بھلائی اور بزرگی کی داد دی جا رہی تھی لیکن ایسی
ترکیبوں کا نتیجہ بھی اُلٹا ہی نکلا اور سارا طلسم ٹوٹتا ہوا معلوم ہوا۔ یہ رنگ دیکھکر رضا سٹپٹایا اور
آخری حربے کو بھی کام میں لائے بغیر نہ رہا۔ اُس نے بیوی کو اُکسایا کہ اس شادی سے کھلم
کھُلا ناراضگی کا اظہار کر دیا جائے تاکہ والدین پر اس بغاوت کی زد پڑ سکے اور جس طرح بھی
ہو شہر یار کو پیس کر رکھ دیا جائے۔

عذرا سمجھ دار بھاری بھر کم لڑکی تھی۔ وہ شوہر کی بد قماشی کو بھی اچھی طرح جانتی تھی
اور شہر یار کی سادگی۔ شرافت اور عزیز داری کو بھی۔ اِس کے علاوہ بہن کے دُکھ درد کی شریک
تھی اور اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ شہر یار اور فاخرہ ایسے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں جسے
بے رحم موت بھی مُنہ پھیر کر ہی توڑ سکے گی۔ اُس نے شوہر کی دریدہ دہنی کو دو لفظوں میں کچل کر
رکھ دیا اور اس بُری طرح جل بھُن کر جواب دئے کہ رضا کو اپنا سا مُنہ لیکر خاموش رہ جانا پڑا۔

منگنی ہوئی اور بڑے ٹھاٹھ باٹ۔ کرّو فر اور رِم جھم کے ساتھ ہوئی۔ شہر یار کی ایک ایک

آرزو جوان تھی۔ دِل جوان تھا وہ خود جوانی سے ہمکنار تھا۔ خاندان بھر کو خوشی تھی۔ دو محبت بھرے دلوں کا ملاپ۔ دو اونچے گھروں کا سنگھم۔ کیا کسی کی شادی ہو گی جس شان کی یہ منگنی تھی۔ اِدھر بھی نغموں کی بارش۔ عزیز و اقارب کا اجتماع۔ گہما گہمی۔ آرائش و زینت۔ آراستہ پیراستہ کمرے۔ فرش فروش۔ زیب و زیبائش میٹھی میٹھی مسرت ریز باتیں۔ گانے۔ جاگنے اور اودھم مچانے کی راتیں۔ کِھلے ہوئے چہرے۔ کُھلے ہوئے رنگ۔ نوچ کھسوٹ۔ کھانا پینا۔ ہنسی مذاق۔ ہرنیوں کی سی کلیلیں۔ بلبلوں کے سے چہچہے سہیلیوں کی چٹکیاں بہنوں کی چھیڑ چھاڑ۔ بھاوجوں کی گدگدیاں۔ بیس چڑیلیں ایک طرف۔ موم کی گڑیا ایک طرف۔ باہر نوبت نقارے۔ اندر ڈومنیاں۔ گیت۔ مبارکبادیاں۔ جُگ جُگ۔ جَم جَم کی صدائیں گھر بھر میں رونق۔ کہیں مہندی لگ رہی ہے۔ بال سنور رہے ہیں۔ آیئنہ سے اٹھکیلیاں کیجا رہی ہیں۔ کہیں افشاں چُنی جا رہی ہے۔ پھُول بھرے جا رہے ہیں۔ مسّی کا لاکھا جمایا جا رہا ہے ناز و انداز دیکھے جا رہے ہیں —— اُدھر بھی رَت جگے جمگھٹے اور دل کے دلولے۔ رنگ لا رہے تھے۔ شہر یار نے تجوری کے دونوں پٹ کھول کر آنکھیں میچ لی تھیں۔ دولت۔؟ دولت کیا بلا ہے اُس سے کوئی خود کو بھی مانگ لیتا تو بھی انکار نہ کرتا۔ وہ مسرور تھا شاد کام شادمان۔ دُلہن کو نشان چڑھانے کے لئے جو چیزیں بھیجی گئی تھیں اُن میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس میں شہر یار کا دِل شامل نہ ہو۔ چار دن تک وہ ہنگامہ رہا کہ توبہ ہی بھلی ہے۔ گھر والوں کو کھلانے پلانے کے سوا کسی بات کا ہوش تھا نہ مہمانوں کو ہنسنے بولنے کے علاوہ کسی طرف کی سُدھ بدھ۔ اِس پیمانہ کی محفل برپا ہوئی تھی جو آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آیا کرتی ہے تمام رسمیں ادا ہونے کے بعد لوگ دُعائیں دیتے ہوئے رُخصت ہو گئے۔

شہر یار اور فاخرہ کے دلوں میں کوثر کی موجیں تھیں اور آنکھوں میں جنّت کی کیاریاں

اُن کی محبت۔ زندگی اور دنیا سب سازگار تھے۔ وہ جینے کی طرح جی رہے تھے اور اُن کی ہنستی کھیلتی مخمور نگاہیں جوہی چنبیلی۔ چمپا اور موتیا کے عالم کو چُھو رہی تھیں۔ شہریار کو اب بھی نیند نہیں آتی تھی اور راتوں کو جاگنا پڑتا تھا۔ مگر ایسے تصوّرات کے ساتھ جن کی فرشتے بھی تمنا کیا کرتے ہیں۔ فاخرہ بھی سیتے سیتے پڑھتے پڑھتے کسی خیال سے یکایک چونک پڑتی تھی۔ لیکن فوراً ہی ایک لطیف سی کپکپی جسم میں دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی اور وہ اُمیدوں کی جوت جگا کر کنول کے پھُول کی طرح شگفتہ ہو جاتی۔

منگنی کے بعد فاخرہ شہریار کے سامنے آئی تو حیا۔ لاج۔ شرم اور اُس شے جمیل کیساتھ جسے فطرت کی زبان میں دوشیزگی کہتے ہیں۔ اُس نے فاخرہ کو بارہا دیکھا تھا۔ لڑکپن سے دیکھتا اور پوجتا آیا تھا۔ مگر اِس رنگ میں دیکھکر اس کی رُوح وجد کرنے لگی۔ بہت پیار۔ بہت نرمی بہت ہی نیازمندی کے ساتھ گردن اونچی کی اور سیدھے رُخسار پر دھیرے سے چار انگلیاں مار کر جی ٹھنڈا کر لیا۔

بہت شرم آ رہی ہے ——؟

جی — ! فاخرہ نے ناز سے پلکیں جھپکا کر جواب دیا۔

ایک ہفتے کہاں رہیں —— ؟

گھر ہی پر —— !

یہاں تو آنکھیں ترس گئیں — !

کیا بتاؤں۔ رضا بھائی نے آپا جان کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کسی نہ کسی بات پر روز لڑائی ہو جاتی ہے۔ !

شہریار کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی — !

اوہو۔ ابھی اُن کے دل کا بخار نہیں نکلا ——— ؟

فاخرہ غمگین ہوگئی ۔ !

تم ملول کیوں ہوتی ہو جنھیں شکست ہوئی ہے وہی سوگ منائیں گے ۔ ؟

شریر آدمیوں کو شکست نہیں ہوا کرتی۔ شرارت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ؟

اُن کی طرف دھیان ہی نہ کرو۔ چند روز میں رو دھو کر بیٹھ جائیں گے ۔ ؟

فاخرہ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ ! ——— یہ کیا ہو رہا ہے ؟

جی ہولتا ہے کہیں تمھیں نقصان نہ پہنچائیں۔ وہ بہت بُرے آدمی ہیں ۔ ؟

جی بھاری نہ کرو فاخرہ۔ اُن کی کیا مجال ہے جو آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکیں۔ ؟

کہتے تھے اُن کا مزاج تو اچھی طرح درست کیا جائے گا ۔ !

منگنی کے وقت کچھ نہ بگاڑ سکے تو اب کیا بگاڑیں گے ۔ ؟

تاہم اُن سے ہوشیار رہنا چاہیئے ۔ ؟

مُناسب جو حکمِ سرکار ——— ؟

فاخرہ کو پھر حجاب آگیا۔ اور آنسو خشک کرتے ہوئے آنچل سے مُنہ چھپا لیا۔

تھوڑی دیر کے لئے سیر کو چلو گی ۔ ؟

نہیں ۔ سردی لگے گی ۔ ہم ابھی نہا کر آئے ہیں ۔ ؟

سب طرف کی کھڑکیاں بند کر دیں گے ۔ ؟

بھئی ——— ؟

اکیلے ڈر معلوم ہوتا ہے ۔ ؟

اُس نے تیکھی تیکھی نگاہ سے دیکھا۔ ؟

چلی چلو۔ کئی دن سے جی چاہ رہا ہے۔ شہر یار نے محبت اور خوشامد سے کہا۔ !

فاخرہ کچھ جھجکی سی ہوئی اور شہر یار نے ہاتھ پکڑ لیا۔

تم بڑے وہ ہو ـــــــ ؟

شہر یار ڈرائیو کر رہا تھا۔ فاخرہ برابر سیٹ پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے کلوپیٹرا اپنی حسین کشتی میں بیٹھا کرتی تھی۔ گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی پھر بھی اُسے سردی معلوم ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد دانت بجنے لگا۔ شہر یار نے کار تھما کر اپنا کوٹ اُسے پہنا دیا۔

مَیں نے باغ از سرِ نو درست کرانا شروع کر دیا ہے۔ ؟

کیوں ـــــ ؟

تمھارے واسطے۔ باغ پسند کرتی ہو نا۔ !

کیوں نہیں۔ !

اچھے اچھے پودے۔ چھوٹے چھوٹے پیڑ۔ بیچ میں ایک خوشنما بنگلہ ہو گا۔ چاروں طرف پھولوں کے تختے۔ فاخرہ وہ دن بھی کیسے ہوں گے۔ ؟ شہر یار کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

اُس کی نگاہوں سے بھی بادۂ دوشینہ کا سا خمار جھلکنے لگا۔ !

فاخرہ گاڑی سے اُتر کر جانے لگی تو شہر یار کو پہلو سے دل نکلتا ہوا معلوم ہوا۔ اُس نے بیتابی کے ساتھ روک لیا۔

تھوڑی دیر اور ـــــــ ؟

ابھی تمھارا جی نہیں بھرا۔ ؟

شہر یار کا جی ——؟ اُس کے پاس مزید شرح کے لئے الفاظ نہیں تھے۔

رات ہوئی جاتی ہے ——؟

ذرا کے ذرا ٹھیر جاؤ ——؟

کیوں – ؟

ہر بات پر "کیوں" نہ کہا کرو – ؟

کیوں – ؟ فاخرہ نے انتہائی سحر کاری کے ساتھ کہا۔

شہر یار کی نگاہیں اُس کے چہرے پر نچھاور ہوگئیں – !

دِل چلوں کی سی باتیں کیوں کیا کرتے ہو – ؟

بتادوں ۔ناراض تو نہیں ہو گی – ؟ شہر یار جانتا تھا کہ فاخرہ باتوں میں ہارنے لگتی تو فوراً بگڑ جاتی ۔اور جب تک وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا نہ ہوجاتا سامان میں نہ آتی – ؟

ناراض ہونے کی بات ہو گی تو ناراض بھی ہوں گے – ؟

تمھیں ناراض کر کے قیامت کو کون آواز دے – ؟

سچ مچ دل چل گیا ہے – ؟

جسے میری فاخرہ مِل جائے اس کا دل نہ چلے تو کیا ہو – ؟ اُس نے شرابی کی زبان میں کہا۔

فاخرہ کے چہرے پر سنجیدگی ۔جبینِ ناز پر شکن آگئی ۔شہر یار نے جلدی سے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے ۔کہیں بگڑ کر چلی نہ جائے ۔

اُسے بھی اس شیفتگی پر پیار آگیا ۔ہار کر وہیں سیڑھی پر بیٹھ گئی ۔شہر یار اُس سے ایک سیڑھی نیچے بیٹھ گیا ۔اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا ۔فاخرہ خلافِ معمول

چونکی ہچکی نہ بد دل ہوئی بلکہ غیر شعوری طور پر اس کی انگلیاں بالوں میں اُلجھنے لگیں۔

بس اب جانے دو۔ ؟ دو منٹ بعد فاخرہ نے بال نوچ کر کہا۔

اب کس روز ملوگی۔ ؟

اسی طرح ستانے کو جی چاہتا ہے۔ ؟

نہیں نہیں۔ ! شہر یار نے گھبرا کر یقین دلایا۔

جمعہ کو اسی وقت ——!

دیکھو فاخرہ بھول نہ جانا —— ؟ وہ بالکل بچوں کی طرح وعدہ لے رہا تھا۔

فاخرہ کو ہنسی آگئی۔

شہر یار کی منگنی رضا کے کلیجے پر تیر ہو کر لگی۔ اس کی کامیابی نے نخوت و غرور کے تار پود بکھیر کر رکھدئے تھے۔ رضا نے بات اُڑانے اور اُسے تباہ کرنے کے لئے کچھ کم جال تھوڑی بچھایا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی حربہ ضرور کارگر ہوگا۔ جس کے نتیجہ میں شہر یار کو زک اُٹھانی پڑے گی۔ لیکن اُس کی قسمت سامنے تھی۔ رضا کا فریب خود اُسی پر اُلٹ پڑا اور وہ سخت مجبوری کے عالم میں اپنا سا مُنہ لیکر رہ گیا۔ کوئی بھلا آدمی ہوتا تو اِسی چوٹ کو سہلا کر خاموش ہو جاتا۔ مگر رضا اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو سانپ نکل جانے کے بعد لکیر کو نہیں پیٹا کرتے۔ اُس کا غصہ پہلے سے بھی دُگنا ہو گیا۔ اور اُس نے اپنے باپ دادا کی عیاشیوں کی قسم کھا کر مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ شہر یار کو ہر ممکن طریقے سے ستاتا رہیگا۔ اور موقع آنے پر کوئی ایسا نشتر چبھوئے گا جس کی اذیت اُسے سدا تڑپاتی رہے گی۔ رضا کی بدشعاری سب سے پہلے غریب عذرا کی طرف منتقل ہوئی۔ ہر وقت کڑوی کسیلی باتیں کی جانے لگیں۔ جُرم یہ تھا کہ

اُس نے شہریار کی منگنی کے سلسلے میں اس کی شرارتوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اور شوہر کی فرعونیت پر بہن کو قربان کر دینے کی حماقت نہیں کی تھی۔ کچھ دن کی سخت و سُست کے بعد رضا پھر اپنی دنیا میں لَوٹ آیا اور دوستوں کی محفل جم گئی۔ پینے پلانے اور کھانے اُڑانے کی رسمیں باقاعدہ ادا ہونے لگیں۔ مگر پاس بیٹھنے والے کبھی کبھی شہریار۔ منگنی اور شکست کا نام لے کر اس کے شیشے میں ہوش کی ڈال دیا کرتے اور وہ سہ آتشہ میں بھی زہر کی سی تلخی محسوس کیا کرتا۔

رضا اور شہریار ماحول کے لحاظ سے دُور نہیں تھے اور گاہے ماہے رسمی دُعا سلام ہو جاتی تھی۔ شہریار چاہتا تو رضا کو جینے اور مُنہ دکھانے نہیں دیتا لیکن اُس کی سنجیدگی سکوت ہی کو فتح جانتی تھی اور کسی قسم کی سرشوری کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ یہی وہ سرد مہری تھی جو اس کے احباب میں پسندیدہ تھی نہ رضا کے ساتھیوں کے لئے قابلِ قبول۔ سب کا فائدہ اسی میں تھا۔ شہریار اور رضا دونوں آپس میں ٹکرائیں۔ دو دو چونچوں کا سلسلہ برابر جاری رہے اور اُن کی خیر خواہی ناکامی سے دوچار نہ ہو۔

زیادہ تر لوگ ایک طرف کے تھے اور دوسری طرف سے سروکار نہ رکھتے تھے۔ بعض لوگوں کا جنھیں سمجھ بوجھ اور عقل و ہوش کے اعتبار سے ابوالفضل پر طنز کرنے کا حق حاصل تھا۔ اپنے رکھ رکھاؤ کے پیشِ نظر اِدھر بھی ربط ضبط تھا اور اُدھر بھی اُٹھنا بیٹھنا۔ بظاہر تو یہ لوگ غیر جانب دار تھے۔ مگر اصل میں فساد کی جڑ یہی تھے اور گھاتوں کے ساتھ باتیں اِس طرح پروتے تھے کہ بات بھی برچھی کی نوک بنجاتی تھی اور ان کی آنکھوں میں بھی فرق نہیں آتا تھا۔

زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ کبھی دن بڑے ہونے لگے۔ کبھی راتیں۔ رضا اپنی رام رنگی در رنگ بھومی میں رہا۔ شہریار کی دشمنی بھی موجود تھی اور تخریبی کارروائی کی حسرت بھی۔ پر دنوں کے

ہمراہ ہنگامہ خیزی رخصت ہوتی رہی۔ اور اب وہ کچھ بے تعلق اور کچھ متین دکھائی دیتا تھا۔ شہر یار کو بھی دشمنوں کی پروا نہیں تھی اور اپنی بستی بسانے کی دُھن میں لگا ہوا تھا۔ اُس کا شوق چاروں طرف سے طرح طرح کی چیزیں چُن چُن کر لا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فاخرہ کے لیے دنیا کی کوئی نعمت اُٹھا کر نہ رکھی جائے۔ گھر میں خدا کے فضل کی کمی تھی نہ دل میں آرزوؤں کی۔ جی کھول کر ذوق پُورا کیا جا رہا تھا۔ فاخرہ سے ہفتہ میں دو تین بار ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اور وہ چین سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُسے دُنیا جہان کی خبر تھی نہ صبح شام اور دھوپ چھاؤں کا ہوش۔ دل کی آسودگی نے تاروں کی سی جو راہ بنا دی تھی اُسی پر دیوانہ وار چلا جا رہا تھا۔

ایک سہ پہر کو شہر یار آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ چہرے پر شادکامی کی خنکی تھی۔ آنکھوں میں محبّت کا سرور۔ کسی خیال نے اُسے اتنا خود فراموش کر دیا تھا کہ مرزا آ کر بیٹھ بھی گیا اور اُسے مُطلق احساس نہ ہوا۔ جب مرزا ہی نے شانہ ہلایا تو وہ چونک کر مُسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

اوہ۔ مرزا صاحب ہیں ؟

جی سرکار !

آج کہیں راستہ تو نہیں بھُول گئے۔ کیسے کرم فرمایا۔ مزاج تو اچھا ہے۔ ؟

صاحبِ عالم۔ کیا عرض کروں۔ جو کچھ مَیں کہنا چاہتا ہوں اُس سے آپ کو یقیناً رنج ہوگا۔ مگر یہ عزت اور زندگی کا مُعاملہ ہے جی نہیں چاہتا کہ ذرا سے دُکھ کی خاطر بڑے بڑے حادثے برداشت کئے جائیں۔ ؟

ایسی کیا بات ہے۔ آپ بلا تکلف فرمائیں میرے دُکھ کا خیال نہ کریں۔ ؟

معلُوم ہوا ہے کہ رضا صاحب آپ کی منگیتر فاخرہ بانو کو ورغلانے پر تُلے ہوئے ہیں

اور انھوں نے طرح ڈالنی شروع کر دی ہے۔!

آپ کیا فرما رہے ہیں ـــــــ؟ شہریار خوف زدہ سا ہو گیا۔

مَیں نے خود اُن کی زبانی سنا ہے۔ کہتے تھے چند روز کی بات ہے۔ چڑیا خود بخود جال میں پھنس جائے گی۔!

بکتے ہیں۔ انھیں باتیں بنانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔؟

خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن آپ کو اطلاع دینا میرا فرض تھا۔؟

آپ کی عنایت ہے مرزا صاحب ـــــــ!

مرزا چلا گیا اور شہریار دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا آ گیا تھا۔ اور چہرے کی چمک صدمے کی وجہ سے ماند پڑ گئی تھی۔ اُسے دل و دماغ میں آگ سی سُلگتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ گہری بیکلی کے ساتھ اُٹھا اور کمرے میں بے طرح ٹہلنے لگا۔

ایک کمزور پہلو تھا جس نے اُسے مغموم کر دیا تھا۔ وہ یہ کہ رضا گھر بھر میں بُری نگاہ سے دیکھے جانے کے باوجود بہرحال فاخرہ کا بہنوئی تھا۔ اور بلا روک ٹوک وہاں جا سکتا تھا۔ کسی نہ کسی بہانے اُسے بُلا سکتا تھا۔ محبت اور رشک سگے بہن بھائی ہیں جس قدر محبت آگے بڑھتی ہے اسی قدر رشک قریب آتا ہے۔ وہ رضا کو جانتا تھا اس کی دولت مندانہ شرارت کے گورکھ دھندے بھی نظر میں تھے۔ کتنی ہی معصوم لڑکیوں کو زندہ درگور کیا جا چکا تھا شہریار بلا سوچے سمجھے فاخرہ سے ملا اور جو کچھ سُنا تھا وہ حرف حرف گوش گذار کر دیا۔ اُس کے تیور پر سلوٹیں۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور طیش کی وجہ سے چہرہ غضبناک ہو گیا۔

وہ ہوش کی دوا کریں ـــــــ؟ فاخرہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بولی۔

شہریار کی جان میں جان آئی۔!

اُنھیں ہوش کی دوا ہی کرنی پڑے گی۔ اب وہ آزاد چھوڑے جائینگے نہ مزید بدعنوانیوں کی اجازت دی جائے گی ۔؟

تم نے کس سے سُنا ۔ ؟

اُن ہی کے ایک رفیق سے ۔ !

اُن کا مُنہ نہ نوچ لوں تو سہی۔ آخر مجھے سمجھا کیا ہے ۔؟

اپنی جگہ چاق و چوبند رہو۔ زبان سے کچھ نہ بولو اپنی ہی بدنامی ہو۔ خدا نے چاہا تو دو تین مہینے کے اندر اندر شادی کا سرانجام ہو جائیگا اور وہ خود اپنی موت سے پہلے مرجائینگے ۔

فاخرہ کا چہرہ غصّہ کے مارے تمتما رہا تھا۔ لیکن شادی کا نام آتے ہی حیا کی لہریں دوڑنے لگیں ۔ !

یہاں آیا کرتے ہیں ۔ ؟

روا داری کون ہو۔ کبھی گاہ بگاہ مہینے میں ایک آدھ دفعہ آنکلتے ہیں ۔ !

اگر ذرا بھی گڑ بڑ معلوم ہو تو مجھے بتا دینا ۔ ؟

اِس کی نوبت ہی نہیں آئے گی ۔ ؟

بس ایک بات کا خیال رکھو۔ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ رضا کی کوٹھی میں کبھی نہ جانا ۔ ؟

مجھے وہاں جانے کی کیا پڑی ہے —— ؟

شہریار نے اطمینان کا سانس لیا اور فاخرہ کی بلائیں لیتا ہوا خوش و خرم واپس آگیا۔ دو گھنٹے پہلے جس حوصلہ شکن بیتابی نے دل کی دنیا تہ و بالا کر دی تھی وُہ دُور ہو چکی تھی اور وہ بشاش نظر آتا تھا۔

فاخرہ کو مضبوط پاکر اُس نے اپنی روش کو بدل دینا ہی مناسب سمجھا۔ رضا واقعی ایسا آدمی نہیں تھا جو شرافت اور سنجیدگی سے مان جاتے ہیں۔ اور دبنے والے کو اور زیادہ نہیں دبایا کرتے۔ شہریار چاروں کھونٹ ہوشیار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور دوستوں جاں نثاروں کو ساتھ لیکر کلب، سینما اور دوستانہ قسم کے ہاکی میچوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جہاں تہاں رضا سے بھی مڈبھیڑ ہونے لگی۔ شہریار نے اس موقع پر زندگی کا پورا پورا ثبوت دیا اور اپنی ذہانت کا طوطی بُلوا کر سانس لیا۔ رضا صرف دولت مند رضا تھا اور شہریار باتوں کا دھنی محفل کا سنگھار، متانت۔ شوخی۔ خوش بیانی جہاں بھی مِل جاتے ہیں قیامت ڈھا دیتے ہیں۔ چند ہی روز میں شہریار سوسائٹی پر چھایا ہوا ملا۔ اُس نے باتوں باتوں میں گھُلا ملا کر وہ فقرے چُست کیئے کہ رضا کو اِدھر اُدھر دیکھتے ہی بنی اور کئی بار بھیگی بلّی بنکر رہ جانا پڑا۔ وہ روپیہ پھینک کر دوست پیدا کر سکتا تھا۔ مگر اُن برابر کے لوگوں کو متاثر نہیں کر سکتا تھا جو محض زندہ دلی کی وجہ سے کلب میں شریک ہوتے تھے۔ اس صورتِ حال نے رضا کی بد قماشی کا دروازہ بند کر دیا۔ اب اس کے ساتھی چمک چمک کر بولتے تھے نہ اِشاروں کنایوں کی بھرمار تھی۔ خود اسکی آنکھیں جھکی جھکی معلوم دے رہی تھیں۔ شہریار نے اپنی طرف سے زیادتی اچھی نہیں سمجھی اور رفتہ رفتہ نرمی اختیار کرتا چلا گیا۔

بظاہر کشمکش ختم ہونے پر شہریار نے شادی کا معاملہ چھیڑا اور چند عزیزوں کی معرفت تاریخ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ اور کچھ عرصہ تبادلۂ خیال اور اقربا سے صلاح مشورے کے بعد تین ماہ کی تاریخ دے دی گئی۔ شہریار نے خدا کا شکر ادا کیا اور تمام فروعی باتوں کو نظر انداز کر کے ساز و سامان شروع کر دیا سب سے زیادہ اُسے باغ کا خیال تھا۔ جسے وہ خیال سے زیادہ رُوح پرور بنا دینا چاہتا تھا۔ شہریار کا بس نہیں تھا ورنہ وہ تو ایک دفعہ جنّت سے باغ و بہار سمیٹ

لاتا۔ اور اس باغ کو بہار کا لطیف شاہکار بناکر فاخرہ کے حضور میں پیش کر دیتا۔ اسکی جائداد کا اعلیٰ ناظم شبانہ روز محنت سے باغ تیار کرا رہا تھا لیکن شہریار نے اسے گھر کے انتظام پر لگادیا اور خود باغ کی نگرانی کرنے لگا۔ بیچ کی عمارت کو اس نے اپنی محبت کے مانند پاکیزہ قسم کے سنگِ مرمر سے بنوایا تھا اور اس کے گرداگرد چنبیلی کے پھولوں کی باڑیں اس انداز سے ترتیب دی تھیں کہ چاندنی راتوں میں وہ پھولوں کا حوض معلوم ہوں اور حوض کے درمیان چھوٹا سا چاندی کا بنگلہ جگمگاتا ہوا نظر آئے۔

باغ پر پہلے ہی سے محنت کی جارہی تھی اور کاریگر اپنی فنکارانہ چابکدستی کے نمونے پیش کر رہے تھے۔ شہریار کے دل چسپی لیتے ہی اور بھی چار چاند لگ گئے۔ درختوں کی قطاریں سجائی گئیں چاروں کونوں پر سرو کے درخت نصب کئے گئے۔ روش روش درست ہوئی۔ باغ تیار ہونے کے ساتھ شہریار کا دل تروتازہ ہوگیا۔ یہاں کے گوشے گوشے میں اس کا شوق بھرا ہوا تھا۔

شہریار نے بھی شادمانی کا سامان تزک و احتشام کے ساتھ کیا تھا۔ اور فاخرہ کے والدین بھی بڑی سے زیادہ چھوٹی کو دینا چاہتے تھے۔ دونوں گھر رچے بچے تھے۔ زر جواہر بھی موجود تھا شان اور شکوہ بھی۔ دونوں طرف شاہانہ تیاریاں تھیں۔ اور دیرینہ آرزوئیں پوری ہونے کا وقت آگیا تھا۔

بیاہ میں کُل ایک مہینہ باقی رہ گیا تھا۔ فاخرہ کے والدین خوشی خوشی جہیز تیار کر رہے تھے۔ اسی دَوران میں دوسری خوش خبری ملی کہ اُن کی عذرا کے ہاں ایک چاند سا لڑکا ہوا ہے ماں باپ کے گلستاں میں بہار آگئی۔ فاخرہ کو اسی قدر مسرت ہوئی جس قدر غیر شادی شدہ خالہ کو بھانجے سے ہوا کرتی ہے سب کے دل انبساط و کیف سے لبریز تھے۔ مدّت کے بعد خدا نے اِس خاندان کو بچّہ عطا فرمایا تھا۔ پھر عذرا کا مُنّا ــــ ؟ گھر کے سب افراد کو کرچاکر اطلاع

ملتے ہی رضا کی کوٹھی روانہ ہو گئے۔ اُن میں فاخرہ بھی تھی۔ اچھی خبر۔ بے پایاں نشاط۔ اُسے اپنا قول وقرار یاد رہا نہ حقیقت میں یاد رکھنے کا یہ موقع تھا۔ وہاں پہلے ہی یہ جشن منایا جارہا تھا۔ اِن لوگوں کے پہنچ جانے سے اور بھی رونق بڑھ گئی۔ چھ دن تک وہ دُھوم دھام ناچ رنگ اور ڈھولک دھیّا رہی کہ پڑوسیوں کو بھی لُطف آگیا۔ ساتویں دن جب ذرا ہنگامہ کم ہوا تو سب تھک کر پڑے۔

سردی کا آخری دَور تھا۔ گلابی موسم۔ گرمی نہ سردی۔ رات بھیگ چکی تھی۔ عذرا کے گرد اس کی والدہ۔ خالہ۔ چچی اور کئی قریبی عزیز خواتین گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔ اِدھر اُدھر کے قصے چھڑے ہوئے تھے۔ بیاہ شادی کا تذکرہ تھا۔ جم کر باتیں گھُٹ رہی تھیں۔ زچہ رانی کا جی بہلایا جارہا تھا۔ ایک دم سامنے والے کمرے سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ سب عورتیں پریشان ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ لیکن صحن سے گذر کر وہاں گئیں تو کمرہ اندر سے بند تھا۔ چیخ کیسا تھا لائٹ بھی گُل کی جا چکی تھی۔

کون ہے ——— ؟ فاخرہ کی ماں نے ڈانٹ کر آواز دی۔

اَمّی ——— ؟

اُن کی رگوں میں تیموری خون تھا۔ کَس کر کواڑوں پر لات ماری۔ تڑ سے دو شیشے گرے اور صحن کی روشنی کمرے میں پڑنے لگی۔ عورتیں حق دق رہ گئیں ——— رضا فاخرہ کا ہاتھ مضبوط پکڑے ہوئے تھا۔ وہ باہر آنا چاہتی تھی۔ رضا اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اِس کش مکش میں فاخرہ کے بال بکھر گئے تھے۔ دوپٹہ علیحدہ جا پڑا تھا۔ منہ کہیں کہیں سے نُچ گیا تھا وہ ہانپ رہی تھی۔ اور وہ قابُو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

عورتوں کو دیکھ کر رضا عقبی دروازے سے ڈرائنگ روم میں غائب ہو گیا۔ فاخرہ نے

دروازہ کھول دیا۔ امّی نے بچّی کو سینے سے لگا لیا۔ عذرا سہم کر رہ گئی۔ اور چھ دن کی زچّہ ہونے کے باوجود گھبرا کر چھپر کھٹ سے نیچے اُتر آئی۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ لوگوں کے مُنہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اوسان درست ہونے پر فاخرہ نے بتایا کہ وہ عصر کے بعد تھک تھکا کر اُس کمرے میں سو گئی تھی۔ اور چراغ جلنے کے بعد رضا دروازہ بند کر کے اندر گھس آیا تھا جس کے نتیجہ میں یہ حادثہ پیش آیا۔ شہریار کی پھوپھی اور بڑی ہمشیرہ بھی موجود تھیں۔ اور دوسری رشتہ دار خواتین بھی، کِس کِس کے مُنہ میں گھنگنیاں دی جا سکتی تھیں۔

راتوں رات یہ خبر شب کی سیاہی کی طرح پھیل گئی۔ کوئی گھر ایسا نہیں بچا تھا جس میں اِس بھیانک واقعہ پر گفتگو نہ کی گئی ہو۔ بڑے بوڑھے چُپ تھے۔ نوجوانوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ رضا پر کوسنے پڑ رہے تھے اور مُٹھیاں بھینچ بھینچ کر گویا اس کا دم نکالا جا رہا تھا۔

شہریار کے باغ میں بس ایک دن کی کسر تھی۔ باغ تیار تھا۔ حوض میں پانی بھرا جا چکا تھا۔ فوّارے چل رہے تھے۔ بنگلہ کی آرائش کی جا چکی تھی۔ پھولوں کے تختے مرتب ہو گئے تھے صِرف دروازے کو سجانا باقی رہ گیا تھا۔ اور ناظم کا خیال تھا کہ وہ کل ہی اس کام کو ختم کرا کر شہریار کی خوشنودی حاصل کر سکے گا۔

شہریار کو یہ خبر پہنچی ہو تو وہ کمرۂ خاص میں بیٹھا ہوا مقامی حکّام۔ رؤسا اور معززین کے ناموں پر نظرِ ثانی کر رہا تھا اور ابھی ابھی اپنے قلم سے رضا کے نام کا مُسکرا کر اضافہ کیا تھا۔ یہ خبر سُنتے ہی وہ سکتے میں آ گیا۔ اور خاصی دیر تک اپنی موجودگی کا بھی احساس نہ ہو سکا جیسے اندر ہی اندر کسی نے دِل کی حرکت بند کر دی ہو۔ جس طرح بیٹھا تھا اُسی طرح بیٹھا رہ گیا۔ قلم ابھی تک اونچے اُٹھے ہوئے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اور بائیں ہاتھ کی تینوں درمیانی انگلیاں فہرست پر ٹکی ہوئی تھیں۔ یہ عالم دیکھ کر پھوپھی نے شفقت کے ساتھ شانے پر ہاتھ

رکھا۔ہمشیرہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہونے کی بجائے بھائی کے پاس بیٹھ گئیں۔شہریار نے نگاہیں اوپر اُٹھائیں اور سیدھی طرف ذرا ترچھی کر کے زمین پر جما دیں۔اُس نے ٹھنڈا سانس بھرنا چاہا۔مگر پورے طور پر بھرا نہیں گیا۔ دل۔ دماغ۔ نظر اور رُوح سب سوگ منا رہے تھے اس گھُٹی ہوئی فریاد۔ اِس بے کسی اور شکستہ پائی پر کوئی دشمن بھی اشکبار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ سب تو زندگی کے ساتھی تھے۔

شہریار تمام رات دھکتے ہوئے کوئلوں پر لوٹا کیا۔اس سانحہ کا جس وقت بھی خیال آجاتا۔ دل پر سانپ سا لوٹ جاتا۔ سینے میں بے انتہا سوزش۔تڑپ اور جھکن تھی۔کوئی جھلس دینے والی شے رگ رگ میں دورہ کر رہی تھی۔شہریار نے کس درجہ خیال آرائیاں کی تھیں۔ کس کس ڈھنگ سے آرزوؤں کے گل پھول توقعات کے ڈورے میں پروئے تھے لیکن قسمت چولا بدل کر سامنے آگئی تھی۔ "مگر فاخرہ رضا کے ہاں کیوں گئی" اس سوال نے احساس کا پہلو بدل دیا۔اور فاخرہ کے وعدے پر غور کرنے لگا۔اُس کا عہد' اس کے فقرے کانوں میں گونج اُٹھے۔شہریار کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔یہ فاخرہ ہی تھی جس نے ذرا سی لغزش پا سے ساری کائنات کا نقشہ بدل دیا تھا اور اُسے مرنے جینے کے قابل نہیں رکھا تھا۔شہریار کی نفرت بغاوت بن رہی تھی۔اُس کی آنکھیں چھت کی کڑیوں سے گلے ملکر ذرا کے ذرا روئیں۔پھر وہ آہنی عزم کے ساتھ تکیہ کمر سے لگا کر بیٹھ گیا۔اور آپ ہی آپ بڑبڑا اُٹھا۔" فاخرہ پر اعتماد کرنا حماقت ہے" زبان سے الفاظ نکلتے ہی شہریار نے بیچ کی انگلی سے آنکھوں میں جو دو آنسو تھے وہ صاف کر ڈالے۔اور انھیں چٹکی مار کر اس طرح پھینک دیا جیسے فاتح کے عہد میں مفتوح کی چیزیں پھینک دی جاتی ہیں۔

صبح خاندان میں جو دوسری خبر آنسوؤں کے ساتھ سُنی گئی وہ یہ تھی کہ شہریار نے منگنی

فسخ کردی ہی۔ لوگ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ گویا اُن کی زبانیں کل گئی تھیں بیچاری فاخرہ۔ ؟ بہت سے دردمند دلوں سے بیساختہ نکل گیا۔

فاخرہ کے گھر میں دوہرا ماتم تھا۔ دُنیا میں مُنہ دکھانے کو جگہ نہ رہی۔ بنی بنائی سرکار کتنی بے دردی سے تباہ ہوئی تھی۔ والدین صدمے کی تاب نہ لاکر بیمار ہو چکے تھے۔ فاخرہ دو ہی دن میں نیم مُردہ معلوم ہوتی تھی۔ لوگ تسلی دیتے تھے۔ بیٹی تیرا کیا دوش۔ ؟ اُسی شیطان کے بچّے رضا پر خدا کی مار پڑے گی جس نے تجھ جیسی نیک لڑکی کو عیب لگانے کی کوشش کی تھی۔ مگر فاخرہ کے آنسو تھمتے تھے۔ نہ مُنہ کھلتا تھا۔ آٹھوں پہر کمرے میں پڑی چُپکے چُپکے رویا کرتی تھی۔

شہریار نے منگنی توڑنے کے بعد فاخرہ۔ اس کی یاد اور نشانیوں کو یوں نظر انداز کیا جیسے وہ فاخرہ کو کبھی جانتا ہی نہیں تھا۔ اُس کی ایک ایک چیز کو اپنے کمرے سے دُور کر دیا۔ ناظم نے باغ کا دروازہ مکمل کرا دینے کی اجازت چاہی مگر صاف انکار کر دیا گیا۔ اُس پر مُطلق وحشت نہیں تھی۔ ہاتھ پاؤں ہوش وحواس صحیح طور پر کام کر رہے تھے اور یہ گمان ہوتا تھا کہ اس انقلاب کا شہریار پر کوئی خاص اثر نہیں ہی۔ اگر کچھ ہے بھی تو صرف اِتنا جتنا کہ کھلونا ٹوٹ جانے پر کسی ناسمجھ بچّے کو ہو سکتا ہی۔

مصیبتوں کے دو پہاڑ ٹوٹ چکے تھے۔ مگر خاندان کے اونچے اونچے ستونوں کو بھی توفیق نہیں ہوئی کہ رضا کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر بدکرداری کی وجہ دریافت کریں۔ اس کے دروازے پر سونے چاندی کے بُت پہرہ دیتے تھے۔ پھر ان حق پسندوں میں اتنی جرأت کہاں سے آتی کہ رضا کو گرم نگاہ سے بھی دیکھ سکیں۔ شہریار پر ستم ہوا اور پھر ستم کی داد دی گئی نہ اُس کے زخموں پر مرہم لگانے کا حوصلہ ہوا۔ اس لئے کہ موجودہ شیطانی تہذیب دھن والوں کو ہر قسم

کے کفر اور ہٹ دھرمی کی اجازت دیتی ہے۔ اُس کا قانون جھپکتی ہوئی شریر آنکھیں رکھتا ہے۔ پہچان پہچان کر بم مارا جاتا ہے۔ دیکھ بھال کر ضابطہ کی کارروائی کی جاتی ہے۔

شہریار نے وطن میں رہنا ٹھیک نہیں سمجھا اور کچھ عرصے کے لئے بمبئی چلا گیا۔ اس کی رائے میں وہاں کی فضا اور چہل پہل دِل لبھانے کے لئے کافی تھی۔ اور وہ دو چار ماہ دل چسپی سے گذارنا چاہتا تھا۔ شہریار نے اعلیٰ سوسائٹی میں شرکت کی۔ سمندری ہواؤں اور بلاؤں سے ترو تازگی لینے کی کوشش کی۔ سیر تفریحوں میں سانس لینا چاہا۔ مگر ہنگاموں سے جی بھاگتا ہوا معلوم ہوا۔ اور اُسے زندگی میں گہری خلا محسوس ہوئی۔ اکثر راتوں کو نیند کم آیا کرتی۔ اور دِن کے وقت مُنہ لپیٹ کر پڑ رہنے کو دل چاہتا۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن شہریار فاخرہ کو کسی عنوان بھی یاد کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کی وعدہ شکنی طبیعت کو میلوں پرے دھکیل دیتی تھی

وہ کوئی ایک ماہ بمبئی میں رہا لیکن ایک دن بھی ہنسی خوشی نہ رہ سکا۔ اُس کے دِل کی بےچینی گئی نہ آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوئی۔ بادلِ ناخواستہ پھر وطن واپس آگیا۔ وہ جتنے عرصہ باہر رہا تھا پھوپھی چچاؤں کو نئے رشتے کی تلاش رہی تھی۔ آخر اپنے ہی جگر یاروں میں ایک قبول صورت لڑکی پسند کی گئی۔ شہریار کو فاخرہ کا نام لینا بھی گوارہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے یہ بات رکھی گئی تو اس نے سر جھکا کر اپنے آپ کو سرپرستوں کے حوالے کر دیا۔ اُن کے خیال میں شادی کے بعد بکلی کا دور ہو جانا یقینی تھا۔ شہریار نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور دنیا کو دنیا ہی سے شکست دے کر دامن بچائے ہوئے نکل جانے کی راہ پیدا کر لی۔

مِل جُل کر چُپ چاپ شادی ہو گئی۔ اور ایک نو بہار دُلہن زینت بن کر گھر میں دکھائی دینے لگی۔ اوّل اوّل شہریار نے گرمجوشی کیساتھ اس کا استقبال کیا۔ ثریّا خوبصورت تھی ہنس مُکھ وضعدار، طرح دار۔ دیکھنے والوں کے خیال میں فاخرہ سے زیادہ دِلفریب۔ لیکن چند ماہ بھی نہ

گذرنے پائے تھے کہ شہریار بددلی کے اُس پار پہنچ گیا۔ جب تک ثریا گھر میں نہیں آئی تھی وہ فاخرہ کو بھولا ہوا تھا۔ لیکن اُسے دیکھ کر فاخرہ کی یاد تازہ ہوگئی اور وہ نورس نورس مُکھڑا اور شرابی ادائیں رہ رہ کر یاد آنی شروع ہوئیں تو پھر اس شان کے ساتھ کہ اُس کے سوا کسی طرف کا دھیان نہیں رہا۔ شہریار پر وہ عالم طاری ہو چکا تھا جس میں مَن و تُو کی قید نہیں رہتی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ فاخرہ پر شدید ظلم ہوا ہے۔ یہ تصور شہریار کے لیے اور بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ جب بھی فاخرہ کا خیال آتا وہ نڈھال سا ہو جاتا۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔

ناظم کو اچانک حکم ملا کہ باغ کا دروازہ سجا دیا جائے۔ یہ وہ دن تھا کہ فاخرہ کی شادی کسی اونچے گھر میں کی جا رہی تھی۔ ناظم سمجھا کہ نئی بیگم کے لئے آرائش کی جا رہی ہے۔ لیکن شہریار کے دِل کی بات اُسے کیوں کر معلوم ہوتی۔ اب شہریار پر دیوانگی کا دورہ ہوتا تو وہ اُسی باغ میں چلا جاتا تھا۔ اور گھنٹہ دو گھنٹے کچھ رسمیں ادا کرنے کے بعد سر جھکا کر واپس آجاتا تھا۔

ثریّا معمولی گھر کی لڑکی نہیں تھی۔ اُس سے لونڈیوں کا سا یہ سلوک برداشت نہ ہو سکا چلتے چلتے پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ دن بدن شکر رنجی بڑھتی گئی۔ اور رفتہ رفتہ سخت کلامی تک نوبت پہنچ گئی۔ شہریار خود اپنے سے بیزار تھا وہ بیوی کو کب خطرے میں لاتا۔ ایک روز جو بات زیادہ بڑھی تو اُس نے ثریّا کو میکے بھیج کر پھر بُلانے کا نام نہیں لیا۔ اور ٹھیک تین مہینے بعد وہی کچھ ہو کر رہا جو ہرگز نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

اِس عذاب سے نجات پانے کے بعد شہریار کو سکون سا حاصل ہو گیا۔ اب اسکی وحشت پر طعن طروز تھے نہ بات بات پر وکیلوں کی سی بحث کی جاتی تھی۔ اسے اختیار تھا کہ راتوں کو سوئے یا نہ سوئے۔ کسی سے بات کرنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ شہریار کی زندگی غم کی بولتی

تصویر تھی۔ اور ماضی کا تصوّر رُوح پرور ہونے کی بجائے اس کے لئے سوہانِ روح تھا جب بھی فاخرہ کی یاد آتی وہ گھٹنوں میں مُنہ دے کر خون کے آنسو رونے لگتا۔ اُس نے فاخرہ پر ظلم کیا تھا اور سہارا دینے کے عوض اس کے پیروں تلے کی زمین نکال لی تھی۔

شہریار اپنے گھر کا مُربّی تھا اور خاندان کی آنکھوں کا تارا۔ چچا پھوپھی سے یہ حالت نہیں دیکھی گئی۔ اُنھیں ڈر تھا کہ اگر یہی لیل ونہار رہے تو ایک دن شہریار گھل گھل کر تمام ہو جائیگا۔ وہ کم از کم اُسے زندہ دیکھنا چاہتے تھے۔ پھر شہریار پر تقاضوں کی یورش ہوئی۔ وہ ملول، رنجور اور دل برداشتہ ضرور تھا۔ مگر بڑوں کے سامنے اَدب سے خاموش رہ جانے والوں میں سے تھا۔ اُس نے پھر گردن جُھکا دی۔ اور سب نے خوشی خوشی ایک اور کانٹوں کی مالا اُس کے گلے میں ڈال دی۔ اُنھیں لوہے اور آگ کا یہ کھیل شاید بھلا معلوم ہوتا ہوگا۔ جبھی تو ایک کی خوشی کے لیئے دوسرے کی قربانی کی جاتی تھی۔

ستارا بیگم — ؟ اپنی ہی ٹہنی کی ایک کونپل تھی عقل شعور، صُورت، سلیقہ سب کچھ تھا لیکن طبیعت میں الھڑپن موجود تھا۔ شہریار نے بہتر سے بہتر سلوک روا رکھا۔ ہر ممکن آسائش بہم پہنچائی۔ اپنی مایوسی کو بھی تبسّم کے پردوں میں چُھپالیا۔ وہ بزرگوں کی لاج رکھ رہا تھا۔ اور اپنی طرف سے نئی بیگم کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باہمی رواداری مہینوں قائم رہی۔ کبھی کبھی بیگم سے کوئی الھڑپن ہو جاتا تو بھی شہریار نگاہ چُرالیتا اور پھیکی ہنسی ہنس کر چُپ ہو جاتا۔ اب اگر ستارا مزاج شناس ہوتی تو اختلاف کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی ماں نے اپنے مقدور کے مُطابق خاصی تعلیم و تربیت دلوائی تھی۔ مگر گھریلو دُوراندیشی کہاں سے آتی۔ اُسے ثریا سے بھی زیادہ سوال کرنے کی عادت پڑ گئی۔ اور وہ بارہا وہ کچھ کہہ گئی کہ شہریار گھٹ گھٹ کر رہ گیا۔ چند مہینے کے لوٹ پھیر میں اختلاف نے بڑھ کر کش مکش کی صُورت اختیار کر لی۔

اور یہ روز روز کی کل کل رنگ لائے بغیر نہیں رہی۔ شہر یار نے اکتا کر نئی بیگم کو بھی ساتھ خیر سے اُن کے میکے پہنچا دیا۔

شہر یار کے دل میں ہر وقت فاخرہ سمائی رہتی تھی۔ اسی کی دُھن تھی۔ اسی کی یاد تھی لیکن وہ اس سے ملنے اور اُسے دیکھنے کے خیال سے بھی کانپ اٹھتا تھا۔ شہر یار کو ڈر تھا کہ فاخرہ اس سے بات کرنا گوارہ نہیں کرے گی کتنی ہی مرتبہ اس نے سُنا تھا کہ فاخرہ اپنے عزیزوں میں کسی تقریب۔ کسی شادی غمی کے سلسلے میں آئی ہوئی ہے۔ اس کا لُٹا ہوا شوق۔ پسا ہوا رومان اُبھرنا چاہتا تھا۔ مگر احساس قدم بڑھانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ شہر یار ان ہستیوں میں شامل ہو چکا تھا۔ جو دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے اُٹھ جاتی ہیں۔

ستارا بیگم کی علیحدگی شہر یار کو بہت مہنگی پڑی۔ اور غیروں کے ساتھ اپنوں کی خشمگیں نگاہوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ جو لوگ شہر یار اور ستارا کو جانتے تھے انھیں تو حق بات کہنے سے باک نہیں تھا۔ لیکن ستارا کے متعلقین کو قدرتی طور پر لڑکی کی طرف داری منظور تھی اور وہ شہر یار کی مخالفت پر کمر بستہ نظر آتے تھے۔ اِس قسم کی بدعنوانیوں نے شہر یار کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا کر دیا۔ اور وہ پہلے سے زیادہ جھنجھلا جھنجھلا کر باتیں کرنے کا عادی ہو گیا۔

خاندان کے لوگوں کی مخالفت نے شہر یار کی زندگی تلخ کر کے رکھدی اور وہ موت کی دعائیں مانگنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اب اگر شہر یار معمولی حیثیت کا آدمی ہوتا تو دنیا اسے بھول سکتی تھی وہ دنیا کو ٹھکرا سکتا تھا۔ مگر وہ لمبی چوڑی جائداد کا۔ زر کا۔ زمین کا مالک تھا گھر میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے بہت سی ذمہ داریاں اُس پر عائد تھیں۔ اور اکثر جینے کے لئے مجبور ہونا پڑتا تھا۔

اِدھر گرمی کی یورش تھی۔ آسمان آگ برسا رہا تھا زمین آگ اُگل رہی تھی۔ اُدھر

ستارا کے ابّا جان نے حق حقوق کا ذکر چھیڑ دیا تھا جس پر شرعی بحث کی جا رہی تھی۔ قانونی موشگافیاں چھانٹی جا رہی تھیں اور طرفین کی زبانیں۔ تار اور تحریریں مشین کی طرح چل رہی تھیں۔ ہر چند کہ شہر یار ضبط و تحمّل کا پتلہ تھا۔ غم درست تھا۔ غم کی سہار تھی لیکن اس فضا میں سانس لینا مشکل ہو گیا۔ اُس نے گھبرا کر کشمیر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ شملے اور مسوری جانے کی صورت میں بھی اغیار کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔ ہر طرف کوفت ہی کوفت تھی اور وہ تنہائی صرف تنہائی چاہتا تھا جہاں بیٹھ کر رونے کی کوشش کر سکے۔

شہر یار کشمیر پہنچ گیا۔ یہاں فضا بھی خوشگوار تھی۔ ہر وقت کی جلن بھی نہیں تھی اطمینان سے دن گذرنے لگے۔ اُسے اپنا خیال رہا تھا نہ دوست دشمن اور فاخرہ کا۔ آہستہ آہستہ شہر یار کی طبیعت بہلتی رہی۔ زندگی قریب آتی گئی۔ وہ بشاش بھی نظر آنے لگا۔ اچانک اُسے معلوم ہوا کہ فاخرہ بھی نند بھاوجوں کے ساتھ یہاں آئی ہوئی ہے۔ شہر یار کے دل میں بہ یک وقت مایوسی اور مسرّت کی لہریں دوڑ گئیں۔ فاخرہ کو نگاہیں ڈھونڈھتی تھیں۔ دِل خوف کھا کر بھاگتا تھا۔ ایک سانس میں جنّت کی ہوا آتی تھی دوسرے میں دوزخ کی لپٹیں اُٹھتی تھیں۔

شہر یار فاخرہ سے شرمندہ تھا۔ اُس کے سامنے جانے کی ہمّت نہیں رکھتا تھا پھر بھی شام کی سیر جاری ہو گئی۔ شاہی باغات سینما اور کشتیوں میں جی لگنے لگا۔ ایک دن سینما کے راستے میں اُسے فاخرہ نظر آئی اور وہ ششدر رہ گیا۔ زمین نے پاؤں پکڑ لئے اور آنکھ بچا کر چلا آیا۔ شہر یار پر اس واقعہ کا بہت اثر تھا۔ پہروں سوچا کرتا تھا۔ آخر ذہنی انتشار قلب کی طمانیت چھین کر رہا اور اس پر بخار کا سخت حملہ ہو گیا۔ شہر یار چار روز تک بُری طرح پڑا رہا۔ پانچویں دن کہیں جا کر سکون حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ جو ایک ملازم تھا اُس کی ایک رشتہ دار عورت فاخرہ کی بھاوج کے ہمراہ آئی تھی۔ اسی کے ذریعہ شہر یار کو فاخرہ کی آمد کا حال معلوم ہوا تھا۔

تین چار دن ٹھیر کر شہریار کو پھر بخار چڑھا۔ بہت تیز حرارت تھی۔ سارا جسم پُھنکا جا رہا تھا ہاتھ پیروں سے آگ نکل رہی تھی۔ شام کو دوائی پینے کے بعد ہوش نہیں رہا۔ دو نوکر ساتھ تھے انھوں نے گھر تار دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر شہریار نے منع کر دیا تھا۔ اور صرف ڈاکٹر کو بُلانے کی ہدایت کی تھی۔ میز پر دوائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ نوکر بے ہوشی کی وجہ سے خائف تھے۔ اور کوئی بات بن نہ آتی تھی۔

سردی کافی بڑھ چکی تھی۔ باہر زور سے ہوا چل رہی تھی۔ نوکر باہر بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ کمرہ خاص طور سے گرم کیا گیا تھا۔ شہریار پر دو لحاف پڑے ہوئے تھے۔ بخار اپنے شباب پر تھا۔ دو گھنٹے یونہی گذرنے کے بعد شہریار کو پسینہ آیا اور اعضا کی دُکھن کے ساتھ آنکھ کھلی۔ اُس کے ماتھے پر ایک نرم نرم ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ شہریار کو خواب کا سا گمان ہوا۔ چند لمحے سوچ کر اُس نے جسم کو حرکت دی۔ اور دھیرے دھیرے آنکھیں کھول کر اونچی کیں تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اُس کے سرہانے فاخرہ بیٹھی ہوئی تھی۔ شہریار نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اور اُس نے پیشانی پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔

اب کیسی طبیعت ہے ——— ؟

شہریار کے ہونٹ سل گئے تھے۔ !

کب سے بخار آ رہا ہے ——— ؟

ایک ہفتہ ہو گیا۔ !

فاخرہ نے شیشی اُلٹ کر ایک اور خوراک دی۔ شہریار تکیہ کے سہارے بیٹھ گیا۔ !

وہ سر ڈھانک کر متانت سے کُرسی میں سما گئی۔ !

یہاں کا پتہ کس نے بتایا ——— ؟

تمہارے مُلازم نے ——— !

ایک منٹ کے لئے دونوں خاموش ہو گئے - !

شہریار نے ہلکے سے ایک آہ بھری - !

لیٹ جاؤ ——— ؟ اُس نے نیچی نگاہ سے کہا -

شہریار اُٹھ کھڑا ہوا - جیسے بخار اُسے چڑھا ہی نہیں تھا -

وہ دیوی کی طرح شان کیساتھ خاموش بیٹھی تھی - !

فاخرہ ——— ؟ شہریار اس کے پیروں میں بیٹھ گیا - اور سر اس کے گھٹنوں پر ٹکا دیا

مجھے معاف کر دو گی ——— ؟

اُس کے بالوں میں فاخرہ کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے -

معاف کر دو فاخرہ - میں آگ میں جلا جا رہا ہوں - ؟

وہ گم سُم تھی - ؟

شہریار کی بیتاب نگاہیں اُس کے چہرہ پر لگی ہوئی تھیں - !

قصُور وار تو میں ہوں ——— ؟ فاخرہ نے آنکھوں کے آخری قطرے بہا کر جواب دیا - !

شہریار اور بھی شرمسار ہو گیا - !

اور ٹھیک پہلے کی طرح فاخرہ کی انگلیاں اُس کے بالوں میں چلی گئیں - !

شہریار کو دل میں برف کی سی ٹھنڈک محسوس ہوئی - !

گہرا سناٹا تھا - باہر ہوا چل رہی تھی - کمرے میں آگ کی گرمی تھی سرشار دلوں کی بھی - !

اب میں اجازت چاہوں گی۔ سردی بڑھ رہی ہے۔؟

کتنے دِن قیام رہے گا۔؟

پرسوں جا رہے ہیں ——— !

پرسوں ——— ؟

ہاں۔ اور تُم ——— ؟

تمہارے ہی ساتھ ——— !

فاخرہ جانے لگی تو شہریار نے بدستور ذرا کے ذرا اور ٹھیر جانے کی درخواست کی۔ !

وہ بھی مان گئی ——— اب ناز و انداز کیوں کر کئے جا سکتے تھے۔ !

یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ ؟

جس کم بخت کو فاخرہ نہ مل سکی ہو۔ وہ جتنا بھی تباہ حال ہو کم ہے۔ ؟ شہریار آبدیدہ ہوگیا۔

پُرانی باتوں کو بھُول جاؤ۔ اور کوشش کرو کہ جو عہد و پیمان ٹوٹ چکے ہیں پھر جوڑ دئے جائیں۔ ؟

شہریار حیران رہ گیا۔ !

اگر ہم آپس میں ایک نہیں ہو سکے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دِل بھی دکھے جائیں؟

بجا ہے ——— ؟

آج سے خوش و خرّم رہو۔ خود بھی جیو۔ دوسروں کو بھی جینے دو۔ اور ...... ؟

نہیں فاخرہ ——— ؟ شہریار سٹپٹا گیا۔

کیوں نہیں ——— ؟

شہریار نے گردن جُھکالی۔ !

مجھ سے بھی پوچھو۔ میرا کیا فرض ہوگا۔؟

شہریار نے محبت سے بھرپور نگاہیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔!

مَیں تمھیں یاد کیا کروں گی ——— ؟؟؟

فاخرہ نے تیکھی نظر ڈال کر اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور ایک منٹ میں تمام سوئٹر جھیر جھیر کر دیا۔!

وہ بے بس تھی ورنہ اس سے بھی زیادہ سزا دے کر دم نہ لیتی۔!

بس غصّہ ٹھنڈا ہوگیا۔ شہریار کے ہونٹوں پر تبسّم کی کئی دھاریاں تھیں۔!

فاخرہ چلی گئی۔ اور شہریار دیکھتا رہ گیا۔!

دوسرے دن اُس کا سامان باندھا جا رہا تھا۔ فاخرہ کے ساتھ جانا ممکن تھا اور نہ اُس کے بعد جانا آسان۔ شہریار نے ایک روز پہلے چلے آنا مناسب سمجھا۔ سہ پہر کو فاخرہ سے مُلاقات ہوئی۔ دیر تک میٹھی میٹھی باتیں ہوتی رہیں لیکن رخصت ہوتے وقت شہریار کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چُھوٹ گیا۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھُوار کی طرح آنسو برسا گئے۔ وہ جی بھر کے روئے گیا۔ اگر اس کے ساتھ فاخرہ بھی نہ رونے لگتی تو شہریار کے آنسو تھمنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ آخر کمال بے قراری اور محبّت کے ساتھ دونوں تڑپتے ہوئے جُدا ہو گئے محبّت نئے سر سے جوان ہو کر دلوں کے رتھ میں سوار ہو گئی تھی۔

شہریار اپنے گھر واپس آگیا تھا۔ اب اُس کے چہرے پر پہلی سی پژمردگی دکھائی نہیں دیتی تھی اور وہ سنجیدہ آدمیوں کی طرح جینے کی کوشش کر رہا تھا۔ صبح کی ہوا خوری بھی تھی۔ شام کو نئے باغ بھی جایا جاتا تھا۔ رات کو ریڈیو بھی بجنے لگا تھا۔ دو ماہ کے بعد کسی رشتہ دار کسی دوست کے

زور دینے پر نہیں شہر یار نے بذاتِ خود ایک معمولی خاندان کی لڑکی سے شادی کرلی۔ لوگ حیران تھے کہ یکایک یہ کیا ہوگیا۔ اِس شادی پر مہینوں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ پھر یہ حقیقت کتنی دلچسپ تھی کہ نئی بیگم شان وشوکت کے لحاظ سے گذشتہ بیگمات سے بہت پیچھے تھیں شکل وصورت بھی کوئی خاص نہیں تھی اور خاندان کی نزہت ریز عظمت مآب لڑکیوں کے زیب زینت والے جھرمٹ میں یوں نظر آتی تھیں جیسے گلابی جورجٹ کے دوپٹے میں ہلکے سے آبی رنگ کے جاپانی ڈوریئے کا پیوند۔ لیکن شہر یار کو سکون تھا اور ایسا سکون تھا جو پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ اُس کی نگاہ میں ایک پھول سا مکھڑا۔ ایک چاندسی صورت مجسّم اکی فاخرہ جگمگایا کرتی تھی۔ وہ شادکام رہتا تھا۔ کبھی کبھی ایک دو آنسو تنہائی میں ضرور آجاتے تھے۔ مگر اُن سے دل نہیں کڑھتا تھا، دل میں ٹھنڈک پڑجاتی تھی +

اپنے کالج میں وہ چار دوست ـــــــــــ ؟ جیسے چار دن کی بہار۔ یا تاج محل کے چاروں طرف چار خوشنما خوبصورت مینار۔ ایک تن ایک مَن ایک رائے۔ کہتے ہیں اِنہی چاروں کے دم سے کالج کی فضا ہمیشہ جگمگاتی رہتی تھی۔ اور اُن کی خوش طبعی خوش مذاقی۔ تبسّم اور قہقہے ہر وقت گونجتے رہتے تھے۔ چاروں کی عادتیں بالکل مختلف تھیں۔ خیالات بھی مختلف تھے مگر باہمی دوستی کا رنگ اتنا گہرا تھا کہ وہ ایک ساتھ مدہوش زندگی کی شاہراہ پر بڑھے چلے جا رہے تھے۔

صابری ———— ؟ ایک نہ سمجھ میں آنے والا خوش رو نوجوان۔ خیالات کے لحاظ سے نیم اشتراکی۔ سوسائٹی۔ ادب۔ تہذیب اور خود اپنے آپ سے بغاوت کرنے کی عادت انتہا پسند۔ مذہب سے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ۔ بہت سا لگاؤ۔ باغیانہ اُپج اتنی تیز کہ شیطان مردود کی اکڑی ہوئی گردن ابوجہل کی مکروہ ہٹ دھرمی کا بھی اعتراف اور اس قبیل کے تمام فرعونوں کی تاریخ مرتب کرنے کا اشتیاق۔ دل میں خدا کا خوف سے ملی جلی شرارت قتل کے بعد بھی جفا سے توبہ نہ کرنے کا عزم۔ اپنا دشمن۔ دوستوں کا دشمن۔ دشمنوں کا بھی یار۔ کالج کے بابا لوگ اُس سے گھبراتے بھی تھے اور خندہ پیشانی سے ملتے بھی تھے۔ اپنی بغاوت اور خدا ترسی کی وجہ سے اچھی خاصی ہر دل عزیزی حاصل تھی اور اُس کا ماحول پریس اور پلیٹ فارم کی طرف گھسیٹے لئے جا رہا تھا۔ لوگ اُسے اللہ میاں کا بدمعاش کہا کرتے تھے۔

اظہر ———— پریدہ رنگ۔ رمیدہ بو۔ پتلا دُبلا کامنی سا نوجوان۔ اپنی ہی اداؤں میں تُلنے کا شوق۔ ہاکی کا بہت اچھا کھلاڑی۔ بننے سنورنے اور اچھی صورت پر مر مٹنے کی تمنا۔ طبیعت میں پرلے درجے کا الھڑپن۔ اُونچا اُڑنے کی دُھن۔ دیہاتی دوشیزہ کی طرح ہنسنا۔ رُوٹھنا اور مَن جانا۔

حامد ———— ؟ گورا گورا رنگ۔ مدرا مدرا بُوٹا سا قد۔ کچھ چھوٹا سا۔ کچھ موٹا سا ملکی سیاست سے گہری دلچسپی۔ علم و ادب سے فطری شغف۔ باتوں میں فلسفی کا سا لوچ۔ دو چار مُلاقاتوں ہی میں کھل جانا۔ دوستوں کے لئے زندہ رہنا مر جانا۔ ٹھیک غالب کے ساتھیوں کا سا انداز۔ مزاج میں نفاست طبیعت میں صلح صفائی۔ موقع بے موقع ہنسنے اور ہنسے جانے کی دھت۔ دوستوں میں کبھی لڑائی ہو جاتی تو وہی ملاپ کرایا کرتا تھا۔

شمیم ———— ؟ تن توش میں تینوں سے زیادہ بھاری۔ تینوں ہی کی تھوڑی

تھوڑی خوبیوں کا حقدار۔ کرکٹ۔ بلیرڈ اور ہر کھیل کا شائق۔ جیتنے سے زیادہ ہارنے کی ہمت محمد شاہ کے مصاحبوں پر طنز کرنے کا ملکہ۔ نام کی رعایت سے نسیم کے ساتھ چمن چمن خود بھی پھرنا اور دوستوں کو بھی اُڑائے اُڑائے پھرنا محفلوں دعوتوں اور پارٹیوں کی جان کھانے کھلانے میں آپ اپنا جواب۔ حاضر جوابی کا چسکا۔ بولے جانے سے سروکار۔ دوستوں کے زمرے میں خلوص۔ رواداری اور پتہ رکھ کر ترپ لگانا سب کچھ جائز۔ جینے کے لئے جینا اور مرنے کا خیال بھی دوسروں کے لئے چھوڑ دینا۔

تین سال تک وہ سب ساتھ رہے۔ اُن ہی کا دل جانتا تھا کہ یہ سنہری رات دن کس شان سے بسر کئے تھے۔ فکر پاس پھٹکتا تھا نہ جُدائی کا تصوّر۔ ہر وقت کھانا کھیلنا پڑھنا لکھنا اور دھینگا مشتی۔ کوئی ایک دوسرے کو ٹھونک ٹھونک کر چلا رہا ہے۔ کوئی محبت کے لہجہ میں ستم ظریفی سے باز آنے کی اپیل کر رہا ہے۔ جی چاہتا ہو کہ یونہی چٹکیاں لی جائیں مگر تیور پر میٹھے بل ڈالنے ضروری ہیں۔ صابری کی دل فریب موشگافیاں۔ اظہر کا بناؤ سنگھار۔ حامد کا عورتوں کا سا سَرتا بَرتا۔ شمیم کی "اجی سُن تو لو" ہنگامہ برپا کرتی رہتی بھی کالج کے دوسرے لوگ اُن کی دوستی پر رشک کرتے تھے بعض جلتے تھے بعض ڈرتے تھے

آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ انھیں آنسوؤں کے ساتھ علیحدہ ہو جانا پڑا۔ دل نہیں چاہتے تھے۔ رُوح تڑپی جا رہی تھی۔ مگر حالات کا تقاضا یہی تھا کہ نئی زندگی میں شامل ہو کر نئے زاویوں سے جدوجہد کی جائے۔ کالج کی یونین نے جو الوداعی پارٹی انھیں دی تھی۔ اس کے نقوش عمر بھر نہیں بھلائے جا سکتے تھے۔

صابری کو ایک ریاست کے تعلیمی محکمے میں انسپکٹر آف سکولز کی جگہ ملی۔ اظہر کے گھر میں خدا کا دیا خاصا کچھ تھا اس نے کالج سے نکل کر صرف شادی کی اور بس۔

حامد کو سیاست اور اخبار نویسی سے مناسبت تھی۔ اُس نے معقول انتظام کرنے کے بعد ایک ہفتہ وار اخبار نکال لیا۔ شمیم نے کالج میں کسی مقصد سے تعلیم حاصل کی تھی نہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آئندہ زندگی کا کوئی مقصد سامنے رکھا تھا۔ کالج کے زمانے میں بھی بلیرڈ جان کے ساتھ تھا اب دوستوں کی غیر موجودگی میں یہی اچھا خاصہ مشغلہ ہو گیا۔ زیادہ جی گھبرایا تو کسی صحت افزا مقام یا بندرگاہ کا دورہ کر ڈالا۔ ورنہ ساتھ کھیلنے والے دوستوں کی کمی تھی نہ اندھا دھند کھیلنے کا گھاٹا۔

زمانہ اپنی رفتار سے گذرتا رہا۔ پُرانی باتیں جاتی رہیں۔ نئی پیش آتی رہیں۔ یہ لوگ بھی نئی ذمہ داریوں کے بوجھ میں دب کر پچھلی باتوں کو یاد نہ رکھ سکے۔

شمیم دن بھر کا نکلا ہوا رات کو گھر میں گھُسا تھا۔ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں جانے لگا تو بڑی ہمشیرہ نے اُسے چند باتیں بتائیں جنھیں سُنکر شمیم کے اوسان جانے لگے۔ اور بےچینی کے ساتھ کمرے میں آتے ہی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ والدین اپنی مرضی سے لڑکے کا گھر بسانا چاہتے تھے اور لڑکا اس خالص ذاتی معاملہ میں والدین کی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔ ہرچند کہ موجودہ زندگی نے ابھی تک اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تاہم وہ کالج کا تعلیم یافتہ بھی تھا اور بلیرڈ کھیلنے والے دوست بھی کچھ کم نئے دماغ نہیں رکھتے تھے اُن کی باتیں۔ اُن کی آزادی نظر میں سمائی ہوئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ شمیم کا جی اندر ہی اندر گھٹا جا رہا تھا اس میں والدین کے خلاف جانے کی ہمت تھی۔ نہ یہ گوارا تھا کہ بغیر دیکھے بھالے کسی لڑکی کو زندگی بھر کا ساتھی بنا لیا جائے۔ پھر یہ حقیقت اسے برگشتہ کرنے کے لیے کافی تھی کہ صابری اور اطہر نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ اُن کی تحریر اور طرزِ حیات سی سکون

برستا تھا۔ وہ برابر ترقی کیے جا رہے تھے۔ صابری کی لیاقت ہر طرح قابلِ لحاظ تھی۔ اظہر چائے کا کاروبار وسیع پیمانے پر چلا رہا تھا۔ ایک حامد نے والدین کی مرضی کو سر آنکھوں پر رکھا تھا۔ لیکن اس کا اخبار زیادہ کامیاب نہیں تھا۔ اس کی زندگی بظاہر دلکشی سے خالی نظر آتی تھی۔ اور وہ تھا بھی فطرتاً صلح جُو۔ امن پسند۔ ٹھنڈے مزاج کا آدمی۔

شمیم نے آج تک دُنیا کو صرف کھیلنے کھلانے کی چیز سمجھا تھا۔ اور عمر عزیز کے بہت سے سال بلا سوچے سمجھے ہاؤ ہو میں گذارے تھے۔ جس قدر عقل موٹی تھی اسی قدر جسم موٹا ہوتا گیا تھا۔ لیکن اب جو دنیا کی کش مکش سے دوچار ہونا پڑا۔ اور دل پر غم کی یورش ہوئی تو ہاتھی سا جسم گھلنے لگا۔ اس نے یہ مصیبت کاہے کو دیکھی تھی۔ چند ہی روز میں بلیرڈ۔ دلچسپی اور دلبستگی کافور ہو گئی اور وہ شمیم کمرے میں منہ لپیٹے دن رات پڑے ہوئے دیکھا گیا۔ جو نصف رات کے بعد بھی مشکل سے گھر آنا پسند کرتا تھا۔

والدین کو اس سے ضد نہیں تھی۔ مگر اُن سے شمیم کی بے پروائی اور آزادی بھی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ آخر ایک نوجوان لڑکے کا چوبیس گھنٹے اُڑے اُڑے پھرنا کہاں تک دیکھا جا سکتا تھا۔ اُنھوں نے شادی کے شکنجے میں کس کر اُسے ذمہ دار آدمی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اُن کی دانست میں اُس کی بہبودگی شادی کر لینے ہی میں پوشیدہ تھی۔

شمیم خدا کے فضل سے متعدد بھائیوں اور بہنوں کا بھائی تھا۔ لیکن اُس سے گھر میں خوش ہی کون تھا۔ اُس کی بے اصولی اور بدقماشی سب کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔ زبان سے کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ مگر عملی طور پر ترکِ موالات کی فضا موجود تھی۔ شمیم کی بوکھلاہٹ یقیناً خودکشی کا عنوان بن جاتی اگر اس کی بڑی ہمشیرہ امداد نہ کرتیں۔ اُن سے بھائی کی بے کسی نہ دیکھی گئی اور جس طرح بھی ہو سکا اُسے دو تین ماہ کے لئے شادی کی بلا سے نجات دلا دی

شمیم نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ اس مدت میں اپنے لئے کاروبار ٹھیک کرنے کے بعد شادی کرلے گا۔

ہمشیرہ کی عنایت سے بگڑی ہوئی بات تو بن گئی۔ لیکن شمیم میں وہ پہلی سی زندہ دلی باقی نہیں رہی اور اسے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ بلیرڈ، سنیما اور دوسری دلچسپیوں میں بھی اس کے لئے کوئی کشش نہیں ہے۔ اُسے خود تیار کردہ راج محل اپنے ہی ہاتھوں مسمار کرنے منظور تھے نہ والدین کی مت پر چلکر دوستوں میں سبک ہونا گوارا تھا ایک ہفتے اسی شش و پنج میں رہا کہ کیا کیا جائے کیا نہ کیا جائے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر اس نے جی بہلانے کے لئے صابری، اظہر اور حامد سے باری باری ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور فیصلہ کرنے کے دو چار دن بعد ہی روانہ ہوگیا۔

وہ ریل سے اُتر کر سیدھا محکمۂ تعلیم میں پہنچا۔ صابری بے نیازی سے دفتر میں بیٹھا ہوا کلرک کو ہدایت کر رہا تھا "پیٹ کے لئے دنیا بھر کی مصیبت مول لی جاتی ہے۔ پہلے اس جہنم کو بھرو پھر کسی طرف مُڑ کر دیکھو"۔ شمیم کو دیکھتے ہی دیوانہ وار لپٹ گیا۔ بڑے تپاک سے بٹھایا۔ شمیم نے ہمیشہ اسے کشمیری پنڈت کی طرح خوش رنگ۔ نرم زبان اور شوخ پایا تھا۔ مگر خلافِ معمول وہ پژمردہ نظر آیا۔ چہرے پر وہ چمک تھی نہ ہاتھ پاؤں میں وہ چونچالی اور زبان میں مٹھاس۔ اُسے صابری کی جگہ ایک غمگین سا چڑچڑے مزاج کا ہمزاد بیٹھا ہوا ملا جس کے سامنے پیٹ کے سوا بظاہر کوئی موضوع نہیں تھا۔ شمیم کو سخت تعجب ہوا۔ صابری کا عہدہ اس کی لیاقت اور خاندانی عروج صاف کہتے تھے کہ اسے موجودہ سماج کا خوش اقبال انسان تصوّر کیا جائے۔ گھریلو زندگی اس نے خود بنائی تھی۔ اس پر سوچنا بیکار تھا۔ شادی بھی اپنی پسند سے کی تھی۔ جس دوشیزہ کو دیکھ کر دم نکلتا تھا۔ وہی زندگی کی طرح جان کے

ساتھ تھی۔ اور کسی شاعر کے نقطۂ نظر سے صابری وہ آدمی ہو سکتا تھا جس سے پوچھ کر صبح کی بہاریں اور شام کی رنگینیاں تبسم فرمایا کرتی ہیں ۔ایک دن شہر کی سیر کرنے کے بعد دونوں دوست سکون سے کمرے میں بیٹھے تو شمیم نے اپنوں کی سی ہمدردی کے ساتھ کہا۔

صابری۔ناراض نہ ہو تو ایک بات پوچھوں ۔ ؟

ایک نہیں دو ——— ؟

آج کل زندگی زندگی ہو یا عذابِ جان —— ؟

صابری چُپ رہ گیا۔ دل پر چوٹ لگی اور ہلکی سی ایک آہ بھر کر جواب دیا۔

عذابِ جان سے بھی بدتر۔ ؟

شمیم کا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا ۔!

کیوں —— !

جس کم بخت کے پر نوچ کر صحنِ چمن میں چھوڑ دیا جائے وہ جواباً کیا عرض کر سکتا ہے۔

پر نوچ کر۔ تمھارا مطلب ...... ؟

ہاں ہاں۔گھریلو زندگی سے ہے۔ !

لیکن .... ؟

مَیں نے شادی اپنی مرضی سے کی تھی۔یہی کہو گے نادوست۔ یہ ایک فروگذاشت تھی جس کی سزا اب تک بھگتی جا رہی ہو اور غالباً اس کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہے گا۔ مَیں نے روحہ کو کالج کے آئینہ میں دیکھ کر رُخِ روشن کی بلائیں لی تھیں پر اُس کے دِل میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔دو بچّوں کی ماں ہونے کے بعد بھی اُسے کالج کی حسین تتلی بنے رہنے پر اصرار ہے۔ وہی ناز و انداز سے زمین پر قدم نہ رکھنا۔روپے کو پانی کی طرح بہا کر

خوش ہونا اور گھر باہر کی کوئی ذمہ داری قبول نہ کرنا۔

سمجھاتے نہیں ——— ؟ شمیم نے اناڑی کی بندوق چلائی۔

کیوں نہیں ——— نرمی کے ساتھ۔ سنجیدگی کے ساتھ۔ آنسو بھر کر۔ بہت سی التجائیں کرکے۔ مگر وہ تو یہی جانتی ہے کہ شادی کرنا اس کا فرض تھا۔ مرنا بھرنا اور نبھانا میرا فرض ہو۔ اوّل اوّل ان باتوں کا خیال نہیں تھا۔ آخر کب تک، انسان کو جینے کے لئے سکون چاہیئے محبت سے سمجھانا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ بددلی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد شکر رنجی اور اب گھر میں چلتی پھرتی دو زندہ لاشیں ہیں۔ ایک کا کام جیتی جان کو کسی قسم کا غم نہ لگانا۔ دوسرے کا کام سرتاپا الم بن جانا۔

شمیم نے صابری کا ایک ایک لفظ دل کے کانوں سے سُنا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کہ اگر اسے روحہ نہ ملتی تو صابری کی زندگی آنسوؤں اور آہوں میں تبدیل ہو کر رہ جاتی اور وہ زمین و آسمان سر پر اُٹھا کر دم لیتا۔ اور اس کی شورش، انتہا پسندی اور بغاوت سماج۔ مذہب اور خدا سے بھی منحرف ہو جاتی۔ اِن لفظوں پر سوچتے سوچتے شمیم نے اس کی موجودہ زندگی کا تصوّر کیا اور کانپے بغیر نہ رہ سکا۔

دو دن کے بعد وہ صابری سے رخصت ہو گیا۔ اب شمیم اظہر کے پاس جا رہا تھا۔ اس نے تمام سفر کچھ تلخ حقیقتوں کے درمیان طے کیا۔ صبح سویرے اظہر اسٹیشن پر کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ دونوں کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔

مدت کے بعد دو دوست ملے تھے۔ بہت ہی شفقت کے ساتھ ملے۔ شمیم نے اظہر کو بدستور شاخِ صندل کی طرح لچکدار پایا۔ چہرہ پر اُڑی اُڑی سی رونق تھی۔ مگر پہلے کی طرح تبسم کھیل رہا تھا۔ دونوں خراماں خراماں پلیٹ فارم پر چلنے لگے۔ گیٹ کے قریب چند اینگلو انڈین

لڑکیاں ملیں۔ اظہر نے ہلکے سے شمیم کے بازو میں چٹکی بھری۔ اور جب ایک لڑکی پاس سے گذری تو اس نے ٹہوکا دیدیا۔ شمیم حیران رہ گیا۔ اظہر تو بہت ہی شرمیلا نوجوان تھا اور اس قسم کی چھیڑ چھاڑ سے گھبراتا تھا۔ اُس زمانے کا حجاب اور یہ بے باکی ——؟

دن بھر اظہر نے اُسے گوناگوں مشاغل میں اُلجھائے رکھا۔ اِدھر کی باتیں۔ اُدھر کی باتیں کھانا۔ پینا۔ ہنسی اور دل لگی۔ جیسے وہ کالج کا زمانہ اور ہوسٹل کا البیلاپن ایک دفعہ واپس لے آئے تھے۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد دونوں سیر کو نکلے تو اظہر اُسے ایک ریسٹوران میں لے گیا۔ وہاں ناچ رنگ۔ نشاط اور فرحت کے تمام سامان موجُود تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ملازم نے چند بوتلیں اور شیشے کے دو گلاس لاکر رکھدیئے۔ شمیم بھونچکا سا ہوگیا۔ اظہر نے مسکراکر نیچی نگاہ سے کاگ کھولا۔ اور اپنا گلاس بھر کر دوسرے کا رُخ کیا تو شمیم نے ہاتھ پکڑ لیا۔

کیا تکلف ہے ——؟

مَیں نے کبھی پی ہے ——!

آج سہی ——!

شمیم نے اُس کی طرف دیکھا آنکھوں میں بن پیئے خمار تھا۔!

تم دیوانے تو نہیں ہو گئے۔؟

ہاں —— ! ہاں کے ساتھ اُس نے گلاس کو خاص انداز سے اُٹھایا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔

اظہر نے پی۔ اور پی اور پی۔ لیکن حیرت یہ تھی کہ عام شرابیوں کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان قابُو سے باہر نہیں تھے۔ اور شمیم کو تعجب کے ساتھ یہ شبہ بھی تھا کہ وہ پینے پلانے

چھلکانے اور لنڈھانے کا عادی ہو چکا ہے۔

شمیم صبح بیدار ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات چکّر لگا رہے تھے۔ اطہر دن چڑھے بستر سے انگڑائیاں لیتا ہوا اُٹھا تو شمیم نے اُسے جالیا۔ اور نرمی کے ساتھ دریافت کیا۔

آج کل تم کہاں جا رہے ہو ——— ؟

مجھے بھی نہیں خبر ——— ؟

جانتے ہو اس بے خبری کا نتیجہ کیا ہو گا۔؟

اطہر دیہاتی دوشیزہ کی طرح مسکرایا۔ !

شمیم نے اپنا بیان جاری رکھا۔ !

کاروبار تباہ ہو جائے گا صحت گر جائیگی۔ بیوی کا دل چھلنی ہو جائے گا۔ ؟

بیوی ——— ؟ اطہر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

شمیم کے کان کھڑے ہو گئے ——— !

وہ ——— ؟ وہ تو دوسروں کا کلیجہ چھلنی کرنے کے بعد بھی آنکھ پر میل نہ آنے دے۔؟ اُس کے چہرے پر متانت تھی۔

اطہر ——— ؟؟؟ جیسے شمیم یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

مَیں غلط نہیں کہہ رہا ہوں ——— ؟

لیکن تم نے تو پانچ سال کی محبت اور رات دن کی دعاؤں کے بعد بہت ہی چاؤ سے شادی کی تھی ——— ؟

یہی سوچا تھا نا۔ کہ ایک حسین بیوی زندگی کا ساتھ دے گی۔ ؟

وہ ساتھ نہیں دے رہی ——— ؟

اُسے اپنے میکے کی بڑائی اور باپ دادا کی تعریفوں سے فرصت ہو تو کم حیثیت شوہر کی طرف دیکھے۔؟

کیا مطلب ——؟

دل نکال کر سامنے رکھ دو تو بھی ہیچ۔ یہاں کی تعمیر بھی تخریب۔ وہاں کی تخریب بھی تعمیر۔ کوئی چیز سمجھ میں نہیں آتی۔ ہر وقت تیوری پر گھُچے۔ ہر لمحہ نئی بات۔ راتیں چلی جاتی ہیں۔ مگر دل سے باتیں نہیں جاتیں۔ ذرا معقولیت سے سمجھاتا ہوں تو والدین کی ماما بیچ میں پڑتی ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ ناز و نعم میں پلی ہوئی بچی دَل دَل مارنے کے لئے نہیں دی گئی ہو۔ پانچ سال تک التجائیں کرنے کے بعد ہاں کی تھی۔ اور وہ بھی تمہاری بے کسی پر رحم کھا کر۔ ورنہ یتیم بچّے کا ہاتھ اِس زمانے میں کون پکڑا کرتا ہے۔ اِس کی دور وٹیاں بھاری ہوں تو یہاں ہر وقت دروازہ کھلا ہوا ہے۔

تعجّب ہے کہ کالج کے دور میں تم جھروکوں میں سے اُسے دیکھا کرتے تھے اور وہ چلمنوں میں سے جھانکا کرتی تھی۔ کیا اِن باتوں کا بھی پاس نہیں کیا جاتا ——؟ شمیم نے ہائیکورٹ کے فیصلے کی سی مثال دے کر آئینی سوال اُٹھایا۔

وہ کہتی ہو۔ اس دیکھنے دکھانے میں دل شریک نہیں تھا۔ سادگی شریک تھی۔؟

شمیم کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔!

مَیں اُسی دولت کی کُھتنی کو فراموش کرنے کے لئے ..... !

جی۔ گویا کوئی اور ذریعہ نہیں ہو سکتا۔؟

ہو کیوں نہیں سکتا۔ عیاشی ——؟؟؟

تم۔ اظہر اور عیاشی ——— ؟ شمیم کھڑا ہو گیا۔

اظہر نے زور سے قہقہہ لگایا۔ جیسے کسی پروفیسر کو طالب علم کی سادہ لوحی پر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔

وہ جھومتا ہوا اندر چلا گیا اور شمیم نے ایک بار پھر سوچا کہ اگر اُس لڑکی سے اِس دُبلے پتلے نوجوان کی شادی نہ ہوتی تو یہ کمیونسٹ پارٹی کا سرگرم ممبر گنا جاتا۔ دھواں دھار تقریریں ہوتیں۔ سرمایہ داروں کو زندہ دفن کرنے کی کوشش کی جاتی اور ساری عمر شعر پڑھتے پڑھتے گذر جاتی۔

شمیم سے اظہر کے پاس زیادہ نہ ٹھیرا جا سکا اور جلد ہی رخصت ہو گیا۔ اب وہ حامد کے پاس جا رہا تھا۔ نئی تہذیب۔ نئے رجحان اور نئے دوستوں نے اُس کے تصور میں اپنی مرضی سے شادی کرنے کا جو ہوائی مستقر بنایا تھا وہ اُسی تہذیب کی بم باری سے شکست ہو چکا تھا۔ صابری اور اظہر کی زندگی کُھلی ہوئی کتاب کی طرح اُس کے سامنے تھی۔ لیکن والدین کی خوشی سے کی ہوئی بہت سی شادیاں بھی اسکی نظر میں تھیں اور اُن کا پس منظر اِن سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ شمیم کے خیالات میں ناقابلِ برداشت اُلجھاؤ پیدا ہو گیا۔ اور وہ تمام راستے کبیدہ خاطر رہا۔

حامد اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا لیڈنگ آرٹیکل لکھ رہا تھا۔ شمیم کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ مدت کے بعد ایک دوست سے مُلاقات ہوئی تھی۔ خوشی کے مارے پھُولا نہ سمایا۔ شمیم تھکا ہوا تھا۔ کھانا کھا کر آرام سے سو گیا۔ سہ پہر کو دونوں ساتھی نہا دھو کر تفریح کے لئے روانہ ہوئے۔ سینما کا ارادہ تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تھی۔ گہمی گہمی فضا۔ پاس سے ایک تانگہ گذرا۔ دو حسین لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ شمیم نے بھی انہیں دیکھا اور حامد نے بھی۔ شمیم نوجوان تھا۔

کھوئے کا پہاڑ نہیں تھا۔ بے محابا زبان سے نکل گیا۔

کیا صورت پائی ہے ——— ؟

حامد خاموش رہا۔ ——— ! اُس نے ہاں، ہُوں کچھ نہیں کی۔

شمیم نے ٹھوکا دیا ——— !

تمہاری نگاہیں حریص ہیں تم ہی دیکھے جاؤ تو اچھا ہو۔ ؟

خوب۔ گویا تم سیدھے سادے مسلمان ہو۔ اور یادش بخیر! تانگوں کے پیچھے سائیکل دوڑانا میرا کام تھا۔ ؟

یقیناً میرا کام تھا۔ پر یہ اُس وقت کی باتیں ہیں جب نہ کوئی میری نگاہ میں تھا نہ میں کسی کی نگاہ میں تھا ——— !

آپ کا مطلب بیگم صاحبہ سے ہے۔ ؟

جی۔ شادی ہونے کے بعد آدمی کی نگاہ۔ دِل اور روح کو بھٹکنا نہیں چاہیئے۔ اگر اُس کا ضمیر اس قسم کی بدعنوانیوں کو روا رکھتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ اپنے عہد اور اپنی کائنات سے بغاوت کر رہا ہے۔ شادی شدہ آدمی ذمہ دار ہوتا ہو جو لوگ اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے وہ آسیب کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور انسانیت کی آنکھ سے اوجھل ہو کر حسین جوانیوں پر منڈھلاتے رہتے ہیں۔

پورے فلسفی معلوم ہوتے ہو ——— ؟

شادی کے بعد فلسفی بننا ہی پڑتا ہو۔ !

لیکن دقیانوسی ——— ؟

آپ چاہتے ہیں کہ اچھی اچھی باتیں بھی پرانی کہہ کر نظر انداز کر دی جائیں۔ !

جی نہیں قدامت کے پردے میں زمانے کے تقاضوں کو چھپا دیجئے۔؟

بجا ہے۔ اگر میں بھی نئے پکھیرؤں کی طرح والدین کی رائے کو ٹھکرا کر نئی نئی ساریوں میں جھلملانے والی بیوی لے آتا تو شاید زندگی کا بھرم کھو کر ایک سال ہی میں زندہ درگور ہو جاتا۔

آپ کے خیال میں اپنی پسند سے شادی کرنا پاپ ہو۔؟

پاپ تو نہیں ہو لیکن اپنے آپ کو ٹُن کر دینا ضرور ہے۔ شمیم صاحب میں نہیں کہتا تجربہ کہتا ہو کہ جو شادیاں از خود کی جاتی ہیں وہ تھوڑے عرصے میں کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتی ہیں اس لئے کہ ہمیشہ جوانی جوانی کی جویا رہتی ہے۔ نگاہوں میں بہار ہوتی ہو۔ دل میں اُمنگیں۔ جسم میں لذیذ کپکپیاں۔ اِدھر کوئی بھولی صورت دکھائی دی۔ کسی شاداب چہرے پر نظر پڑی اُدھر دل ٹوٹ کر آیا۔ نگاہیں بھٹکیں۔ ہاتھ پاؤں لرزے اور زندگی کی بات چیت شروع ہو گئی۔ نہ لڑکے نے لڑکی کے ماحول کو گہری نگاہ سے دیکھا نہ لڑکی لڑکے کے رنگ ڈھنگ جان سکی۔ کچھ عرصہ تک صورت گری ضرور قائم رہتی ہے۔ مگر زندگی کے نشیب و فراز میں پڑنے کے بعد یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ اور روزمرّہ کے مسائل زیر نظر آتے ہی واقعاتی کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ اب طبیعتوں کے جوہر ٹٹولے جاتے ہیں۔ خاندانی اونچ نیچ پر غور کیا جاتا ہے۔ بدمزگی اور پراگندہ خیالی دلوں میں گھر کرتی رہتی ہو۔ نیتجہ ——— ؟ دلوں میں گنجائش ہوئی تو ذہنی خودکشی ورنہ چھوٹ چھٹاؤ یا خوفناک حادثے۔ بس راس مسعود جیسے آدمی کو اس سلسلہ میں اپنی خودپسندی کی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ اس کے برعکس والدین کی نگاہ صورت کے ساتھ سیرت۔ خاندان اور گردوپیش پر رہتی ہے۔ مزاجوں کا توازن کیا جاتا ہے۔ ہڈی پسلی دیکھی جاتی ہے۔ عام حالات پر بحث کی جاتی ہے۔ اور اس طرح کی شادی میں اپنے بیگانوں کے علاوہ پاس پڑوسیوں کا مشورہ بھی شامل ہوتا ہے۔

تم سمجھ سکتے ہو کہ میرا کاروبار وسیع ہے نہ میں بڑا آدمی ہوں۔ پھر بھی خدا کے فضل سے زندگی کامیاب ہے اور محض اس وجہ سے کامیاب ہو کہ والدین نے میرے مزاج میرے خیال اور صورتِ حال کے مُطابق ایک خوب صورت لڑکی میرے پلّے سے باندھی ہے۔ وہ مجھے سمجھتی ہے میں اُسے جانتا ہوں ہمارا کھانا پینا اور مرنا جینا ایک ہے۔ اُس کے آرام کی خاطر میں جدوجہد کرتا ہوں۔ میرے دُکھ درد میں وہ برابر کی شریک رہا کرتی ہے اگر والدین کی رائے کے خلاف میں خود شادی کرنے کی جرأت کرتا تو بلا شبہ زندگی چڑیلوں کا تبسّم بن کر رہ جاتی۔ اور بعض دوسرے ترقّی پسند نوجوانوں کی طرح میں بھی حسین تیتریوں کے ساتھ اُڑا اُڑا پھرتا۔ نگاہوں میں ہر وقت پریوں کے پرے سمائے رہتے۔

باتیں کرتے کرتے دونوں سینما پہنچ گئے۔ شمیم سے جواب بن نہ پڑا اور شرمساری کے انداز میں خاموش ہو گیا۔

حامد نے مُسکرا کر شمیم کو دیکھا اور مینجر کے آفس سے جا کر دو آدمیوں کا پاس لکھوا لایا۔

حامد سینما دیکھ رہا تھا اور شمیم عجیب طرح کے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔

شمیم گھر پہنچ گیا۔ بلیرڈ۔ سینما اور محلّے کے دوست صورت کو ترس گئے تھے۔ ایک چوبیس گھنٹے کا خوش مذاق ساتھی پھر مل گیا تھا۔ لہٰذا کھیل کود اور سیر تماشے کا سلسلہ دوبارہ جاری ہو گیا۔ دو ماہ بعد بڑی ہمشیرہ نے شمیم کو علیحدہ بلا کر چُپکے چُپکے کچھ باتیں کیں تو شمیم نے خندہ پیشانی کے ساتھ انھیں پُورا پورا اختیار دے دیا۔ وہ تعجب میں گئیں اور پھر خوشی خوشی والدین کو یہ مژدہ سُنایا کہ اُن کا مورکھ بھیّا شادی کرنے پر تیار ہے۔

ایک ماہ بعد بڑے دُھوم دھام سے شادی ہوئی۔ ہزار ہا مہمانوں نے شرکت کی۔ صابری۔ اظہر اور حامد سبھی موجود تھے۔ اچھی خاصی دل چسپی رہی۔ شادی کی رات کو راج رانی میرا نے خاص انداز سے جگمگاتی ہوئی محفل میں سہرا گایا تو سب کے دل کی کلیاں سی کِھل گئیں۔ لوگ حیران تھے کہ شمیم کا وہ کھیل میٹر گشت اور رم جھم کیا ہوئی۔ چاند سی دُلہن پاکر شمیم دوستوں سے یوں چھپنے لگا جیسے خزاں آتے ہی سربند غنچوں میں نسیم چھپ جاتی ہے +

ہارسنگھار

آئینہ دیکھ لو۔ خود معلوم ہو جائے گا کہ میری قسمت کی طرح برہم ہو۔ ؟

دیکھ لیا ——— ؟

اس ناراضگی کا سبب ——— ؟

تم کیا چاہتے ہو ——— ؟

نیم وا آنکھوں میں محبت جھُوم جھُوم گئی۔ اور وہ ہلکی سی ایک آہ بھر کر رہ گیا۔

ترسا ترسا کر مارنا اچھا لگتا ہے۔ ؟

ہر وقت تمھارے پاس بیٹھی رہوں ——— ؟ سر کی جنبش نے بالوں کا ایک
لچھا پیشانی پر بکھیر دیا۔

دل پہلے ہی دیوانہ تھا اب اور بھی لوٹ گیا۔

ایسی قسمت تو کہاں ہے۔ لیکن ایک ایک ہفتے غائب بھی رہنا نہیں چاہیئے ؟

مجھے فرصت نہیں ہوتی ہے —— ؟

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ !

صاف کہدو ...... پورے الفاظ ادا نہ ہو سکے۔ ہونٹ کانپ کانپ گئے۔ !

یونہی سمجھتے رہنا —— ؟

اور تم یونہی ستاتی رہنا —— ؟

نوجوان واپس جانے لگا۔ مگر پانچ قدم چلنے کے بعد آگے نہ بڑھ سکا پیچھے مڑکر دیکھا اور
جذبات کی رو میں کھچ کر پھر قریب آگیا۔

اب تمھارے گاؤں میں نہیں آؤں گا۔ ؟

نہ آنا —— ؟

کسی اور سے محبت ہو گئی ہے نا ——— ؟

لڑکی متانت سے بول رہی تھی۔ اِس سوال پر ہنس پڑی ۔

ہاں —— !

اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور روتا ہوا چلا گیا۔

تارا ۔ ؟ پھولوں بھری پھول سی دوشیزہ۔ جوانی کی صبح کا روشن تارا صرف حسین کہدیجئے

سے اس کے حسن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ قیامت ڈھانے کی عمر تھی۔ گلوں کو شرمانے کا زمانہ۔ جب وہ سادگی سے چِٹک کر کھیتوں کے پاس سے گذرا کرتی تو یہ گمان ہونے لگتا کہ غنچے اُسی کی آہٹ پا کر روزانہ چٹکا کرتے ہیں۔ تارا جس قدر خوبصورت تھی اسی قدر ہنس مکھ اور سنجیدہ مزاج بھی۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی پنگھٹ پر جاتی تھی مگر دیویوں کی سی آن بان کے ساتھ۔ جاتے آتے پانی بھرتے خود کسی کو چھیڑتی تھی نہ مسکراتی ہوئی اس البیلی مورت کو کوئی چھیڑنے کی جرآت کر سکتا تھا۔

گاؤں کے پٹواری نے اس لڑکی کو بڑے ناز و نعم سے گودوں میں کھلا کر پروان چڑھایا تھا۔ ہر طرح کی بے فکری دی تھی۔ خود تکلیف اُٹھالی تھی لیکن اُسے سکھ پہنچا کر چین دیا تھا۔ لڑکی بھی ایک تھی اور ماں باپ کے دل میں تمنا بھی ایک تھی۔ وہ تارا کو اپنے آسمان کا تارا بنا کر بھی تھکنا نہیں چاہتے تھے۔

کرن ـــــ ؟ گاؤں کے زمیندار کا سجیلا نوجوان بیٹا تھا۔ لکھا پڑھا ہوشیار بڑی بڑی آنکھیں۔ گورا رنگ۔ چھریرہ جسم۔ زمیندار پانچ میل پرے قصبے میں رہتا تھا۔ اس گاؤں کے علاوہ اس کے دو گاؤں اور بھی تھے۔ لیکن زمینداری کی بجائے اسکی سخت دِلی خود غرضی اور کنجوسی چار دانگ مشہور تھی۔ اور اس میں وہ تمام بُرائیاں پیدا ہو چکی تھیں جو یہودی ٹائپ کے کسی مغرور سرمایہ دار میں ہونی چاہیئے تھیں۔ روپے کے لئے آدمیت کا گلا گھونٹنا اغراض پر انسانیت کو بھینٹ چڑھا دینا اس کے نزدیک روزمرہ کا ایک کھیل تھا۔ گاؤں والے تنگ تھے اور دل ہی دل میں کھولتے تھے مگر تسلط کی وجہ سے زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ اُس کے پاس اسی قسم کے چیرہ دستوں کا ہجوم تھا جو غریب مزارعوں۔ مزدوروں اور کاشت کاروں کے سروں پر بھوتوں کی طرح سوار رہتے تھے۔

اِن واقعات نے زمیندار کے خلاف عوام میں نفرت کا گہرا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اور لوگ اس سے تعلق رکھنا برا جانتے تھے۔ لیکن ایک عجیب بات تھی۔ باپ جس قدر شورش پسند بے رحم اور تنگ دل تھا۔ اُسی قدر بیٹا مرنجاں مرنج۔ خوش فکر اور فراخ دل تھا۔ عوام کو اچھی نظر سے دیکھنا۔ سب سے گھل مِل کر رہنا اور معاملات کو معاملات کی طرح حل کرنا اس کا دستور بن گیا تھا اور جو لوگ کرن کو سمجھ گئے تھے وہ اچھے دنوں کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

کرن اور تارا ــــــ؟ اُن کو سکوت کے عالم میں پاس پاس کھڑا کر دیا جائے تو مرمریں مجسّمے دکھائی دینے لگیں۔ دونوں نہ ٹوٹنے والی ایک زنجیر میں بندھے ہوئے تھے اور منزلوں کی پروا کئے بغیر سادگی کے ساتھ محبّت کی لکیروں پر چلے جا رہے تھے۔

اُن کی محبت ایک حادثے کے نتیجہ ہی میں اُس جگہ تک پہنچ گئی تھی جہاں محبّت بھری جوانیوں کو جنوں کے سپرد کر کے عقل و ہوش رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک حادثہ ہی تھا کہ جنوں کے اشاروں پر چلنے کی بجائے وہ اپنی اپنی راہ چلنے پر آمادہ نظر آنے لگے۔

سہ پہر کا وقت تھا گرمی کا موسم۔ کرن نے گھوڑے سے اُتر کر پنگھٹ کی رانی سے تھوڑا سا پانی مانگا۔ تارا لجیائے ہوئے انداز سے پلانے لگی اور کرن پینے لگا۔ اس نے پانی میں شراب کا سا مزہ پایا۔ پیئے ہی چلا گیا۔ دونوں واپس ہوئے۔ وہ گھڑا لئے چل رہی تھی، یہ گھوڑے کی باگ تھامے ساتھ ساتھ تھا۔ راستے میں کچھ بہکی بہکی باتیں ہوئیں۔ اور سڑک کے موڑ پر نگاہوں ہی نگاہوں میں کچھ کہہ کر چلے گئے۔

چند ہی روز کے ہیر پھیر میں تارا اور کرن کی مسکراہٹ دلی اشتیاق کی آئینہ دار ہو گئی آخر محبّت نے رنگین ڈورے ڈال کر انھیں خوب مضبُوطی سے کس لیا۔ وہ ایک دن بیچ گاؤں میں آنے لگا۔ اور وہ نہر کے پاس والے باغ میں انتظار کرتے ہوئے دیکھی گئی۔ کرن جامن کے

پیڑ تلے تارا کے بالکل قریب گھوڑے سے اُترتا۔ ایک منٹ تک بُت کی طرح دونوں آمنے سامنے کھڑے رہتے۔ پھر ہلکا ہلکا تبسم ہونٹوں پر کھیلتا اور میٹھی میٹھی باتیں شروع ہو جاتیں۔

مجھے دیر تو نہیں ہو گئی ——؟

بالکل نہیں۔ تم تو انتظار کرانا ہی نہیں جانتے —! بات میں بات پیدا کرنا تارا کی عادت تھی۔

وہ ہنس پڑتا۔!

اور وہ رس بھری نگاہ سے دیکھنے لگتی۔!

دونوں باہوں میں باہیں ڈالے باغ کی روشوں پر ٹہلا کرتے تھے۔ کرن اُس کے ساتھ رہ کر زندگی کا حقیقی سکون پاتا تھا اور تارا بھی اُسے دیکھ دیکھ کر جیا کرتی تھی۔ انکے دل محبت نے اپنی چٹکی میں دبا لئے تھے اور روز بروز نیاز و ناز کا جھگڑا مٹ رہا تھا۔

چلتے وقت کرن پہلے تارا کو اپنے سامنے بھیج دیتا تھا پھر خود گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے قصبے کا رُخ کرتا تھا۔ اِس احتیاط نے اُنھیں زمانے کی نگاہوں سے اوجھل رکھا اور لوہے کی دیواروں سے بھی پھوٹ جانے والی محبت کی خوشبو باغ سے باہر نہ جاسکی۔ ایک دن صبح کے وقت کرن اس سے ملکر واپس ہونے لگا تو فضا کی دل کشی اور حسن کی بے پناہ بہار نے تمناؤں میں ہل چل مچا دی اور اس نے تارا سے اپنے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ کر تھوڑی دیر سیر کرنے کی درخواست کر ڈالی۔ وہ جھجکی۔ اِنکار کیا۔ مگر کرن نے منت سماجت کر کے راضی کر لیا۔ اور سہارا دے کر پہلے اُسے بٹھایا پھر آپ بیٹھ گیا۔ اب تارا اس کے بازوؤں میں تھی۔ چند منٹ میں گھوڑا نہر کی پٹری پر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا سے تارا کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور کرن کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔ جب تارا نے ہوا کی یورش سے اُکتا کر اپنا سر اس کے سینے

پر رکھا ہے۔ تو کرن کے جسم میں سنسنی پیدا ہو گئی تھی اور سینے میں جذبات کا طوفان۔
واپس چلو کافی دُور نکل آئے ——— ؟ تارا نے اتنی شیرینی کے ساتھ کہا۔ کہ
کرن نے فوراً باگیں موڑ لیں لیکن واپسی پر رفتار کو کافی دھیما کر دیا۔ یہ فاصلہ وہ زیادہ سے زیادہ
دیر میں طے کرنا چاہتا تھا۔ سکون ہونے پر تارا نے آہستہ سے اپنا سر اُٹھا لیا۔ کرن کو یہ معلوم
ہوا جیسے کسی نے کلیجہ نکال لیا ہے۔ اُس نے پیار سے پھر بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔
اور وہ محجوب سی ہو کر رہ گئی۔

کل صبح بھی آؤ گی — ؟

کیوں ——— ؟

اسی طرح سیر کریں گے — ؟

کسی نے دیکھ لیا تو .... ؟

کرن کو بھی صورت حال کا احساس ہوا — !

زندگی بھر میرے ساتھ رہو گی — ؟ کرن نے دبی دبی زبان سے کہا۔

مَیں کیا جانوں — ؟ تارا شرما گئی۔

نہیں رہنا چاہتیں ——— ؟

میرا کیا بس ہے ——— ؟

مَیں بابا سے کہوں گا — ؟

سچ ——— ؟ تارا نے دلی مسرت کے ساتھ پوچھا۔

سچ تارا ——— اب تمہیں آنکھوں سے دُور رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کرن کی آواز
میں سوز و گداز تھا۔

کرن اور تارا باتیں کرتے کرتے باغ پہنچ گئے۔ آج اُن کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا اور دونوں میں سے جانے کے لئے کسی کا بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن بادل نخواستہ رُخصت ہونا پڑا۔

کرن بھی نیا تخیل۔ نئی دنیا لے کر اپنے قصبے میں آیا اور تارا بھی نئی اُمنگ۔ نیا جذبہ لے کر اپنے گھر پہنچی۔ کرن سارا دن اسی شش و پنج میں رہا کہ باپ کو کس طرح رضی کیا جائے۔ کبھی اس کی نگاہ بوڑھے منیم پر جاتی تھی کبھی بیحد مہربان ماں پر۔ باپ کی ضد اور ہٹ دھرمی سے خائف تھا کہ کہنے کا طریقہ ذرا بھی غلط ہوا تو آفت ہی آجائے گی۔ تارا سارے دن خوشی خوشی گھر کے کام کرتی رہی۔ اس کے کانوں میں کرن کے الفاظ بسے ہوئے تھے اور نگاہوں میں کرن پھر رہا تھا۔ جب تمنائیں کروٹ بدلتیں۔ اور ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ رہنے کا خیال آتا تو تارا کے دل میں لطیف سی کپکپاہٹ پیدا ہو جاتی اور وہ چپکے چپکے کسی رسیلے گیت کے بول گنگنانے لگتی۔

شام کو تارا جھومتی ہوئی نکلی تو گاؤں کی دھوبن روپا نے اشارے سے پاس بُلا کر نرمی سے پوچھا۔

صبح جس گھوڑے سوار کے پاس تم کھڑی تھیں وہ کون تھا۔ ؟

ایک مُسافر۔ جو راستہ بھول گیا تھا۔ !

اُس نے دھوکا دیا۔ ؟

کیا مطلب ——؟

وہ زمیندار کا لڑکا تھا۔ !

کیا کہہ رہی ہو۔ وہ اکیلا یہاں کیسے آجاتا۔ زمیندار کا بچہ بچہ دُشمن ہو۔ ؟

اُسے گاؤں میں جانتا ہی کون ہے۔ ؟

پھر تو نے کیسے جانا۔ ؟

مَیں اُسی قصبہ کی بیٹی تو ہوں۔ میری ماں تیس سال سے زمیندار کے ہاں کپڑے دھوتی ہے۔!

تُو اُسے اچھی طرح جانتی ہوگی۔ ؟

کیوں نہیں۔ اُس کا نام کرن ہے۔ بچپن سے دیکھتی آئی ہوں۔!

تارا سنّاٹے میں آگئی تھی۔ لیکن فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔

زمیندار کی طرح وہ بھی ظالم ہوگا۔ ؟

نہیں جی —— دھوبن نے اس شخص کے سے لہجے میں کہا جو گناہ سے صاف طور پر بچنا چاہتا ہے۔

بہت ہی نیک دل ہے۔ ذرا غرور نہیں کرتا۔ ؟

ہے تو زمیندار کا بیٹا۔ ؟

لیکن باپ سے لاکھ درجہ اچھا۔ ؟

ہوگا —— ؟

تارا آگ کی سی رَو میں جلتی ہوئی گھر چلی گئی۔ اس کا دل خون ہو کر بہا جا رہا تھا۔ کرن اور زمیندار کا بیٹا۔ ؟ لیکن اُس نے اپنے آپ کو ڈاکٹر کا لڑکا بتایا تھا۔ تارا نے کرن کو کبھی غیر معقول نہیں پایا تھا۔ وہ پورے طور پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ ایک دل کہتا تھا کہ کرن نے جُل فریب سے کام لیا ہے۔ ایک دل کہتا تھا کہ دھوبن کو شبہ ہو سکتا ہے۔ تارا سخت پریشان تھی۔ لیٹے چین تھا نہ بیٹھے۔ اچانک اسے تین سال پہلے کے جلسے کا خیال آیا۔ جب

گاؤں میں لڑکوں کا اسکول جاری ہوتے وقت اُس کے باپ نے بتایا تھا کہ زمیندار اور اس کے لڑکے کی تصویر ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں لگائی گئی ہے۔ تارا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور رات انتہائی بے کلی کے ساتھ کاٹ کر صبح اسکول پہنچی۔ بے قراری سے تصویر کی طرف دیکھا۔ ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ کرن بیٹھا ہوا تھا۔ وہی مُسکراتا ہوا چہرہ۔ وہی نشاط آفریں انداز۔ تارا آنکھوں میں آنسو بھر کر واپس چلی آئی۔ اُسے یقیناً دھوکا دیا گیا تھا۔

تارا نے کرن کو دیوتا بنا کر دِل میں جگہ دی تھی۔ اور اس کے ساتھ مل کر صبح شام کی رونق بڑھائی تھی۔ لیکن اپنے گاؤں کے دشمن سے محبت کرنا پاپ تھا۔ تارا چاہتی تو وہ بھی دھوکا دے کر اُسے گاؤں والوں کے سپرد کر سکتی تھی۔ مگر کرن اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اُس نے گھر بیٹھ جانا مناسب سمجھا اور بھول کر بھی باغ کا پھیرا نہیں کیا۔ ایک دن جب وہ پنگھٹ سے واپس آرہی تھی تو راستے میں کرن ملا تھا۔ پر تارا نے دل دے کر بات نہیں کی تھی اور بے رُخی سے گھر چلی آئی تھی۔

کرن نے تارا کے ساتھ چلکر زندگی کی سچّی لذّت پائی تھی۔ اور اس کی طبیعت کا وہ جوہر اُجاگر ہو چکا تھا جسے باپ کی سرمایہ دارانہ ذہنیت دبا دینا چاہتی تھی۔ وہ ہری بھری دُنیا کے خواب دیکھ رہا تھا۔ محبت آواز دیتی ہوئی صاف نظر آرہی تھی۔ لیکن یکایک تارا کے بدلے ہوئے طرزِ عمل نے اُمیدوں کی ٹہنیاں توڑ مروڑ کر رکھدیں۔ وہ تارا کے پاس سے روتا ہوا آیا تھا اور یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اب گاؤں نہیں جائے گا۔ مگر چار پانچ دن ہی میں معلوم ہو گیا کہ تارا کو بھول جانا کرن کے بس کی بات نہیں ہے۔ جس قدر اُسے اور اس کے خیال کو نظرانداز

کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اُسی قدر رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔

ایک روز صبح سویرے کرن بیدار ہوا تو تارا کی یاد نے اِس انداز سے دل میں چٹکی لی کہ وہ تلملا کر بلا سوچے سمجھے چل کھڑا ہوا۔ اور گھوڑا اُٹھاتا ہوا سیدھا پنگھٹ پر آیا۔ تارا اپنا گھڑا بھر کر تھوڑی ہی دُور گئی ہوگی کہ کرن نے اُس کا راستہ روک لیا۔

مجھے جانے دو۔ ؟ تارا نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

تم جاؤ گی۔ لیکن ایک بات سُننے کے بعد ——؟

زمیندار کے لڑکے ہو۔ اسی لئے حکم چلاتے ہو نا۔ ؟ اُس نے نشتر چبھویا۔

تم پر کون حکم چلا سکتا ہے۔ التجا کی جا رہی ہے۔ ؟ وہ آبدیدہ ہو گیا۔

کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ ؟ تارا کا دل پسیج گیا۔

یہاں نہیں باغ میں چلو ——؟

تارا جانا بھی نہیں چاہتی تھی اور چُپ چاپ جا بھی رہی تھی۔

بس یہی قصُور ہے کہ میں …… ؟

ہاں تم نے مجھے دھوکا دیا۔ تارا کے ماتھے پر بَل پڑ گیا۔

تارا۔ میرے باپ کی زیادتیوں نے گاؤں والوں کو بہت دُکھ دئے ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ صحیح نشان بتانے سے کہیں تم نفرت نہ کرنے لگو —!

بیشک ایسے ظالم باپ کے بیٹے سے محبت کی توقع دیوانگی ہے۔ ؟ تارا کے ارادے میں استحکام تھا۔

لیکن میں تو باپ کے ظلم میں شریک نہیں ہوں۔ ؟

جھوٹ بولتے ہو۔ تم نوجوان ہو۔ زبان میں قوت رکھتے ہو۔ ہاتھ پیروں میں جان۔

تم ساتھ نہ دو تو اُن کا بڑھا پا ظلم کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

تم نے غلط سمجھا تارا۔ مَیں بے بس ہوں۔ سب کچھ اُنہی کے ہاتھ میں ہے۔!

جو شخص مقدور رکھنے کے باوجود بے بسی کے ساتھ گاؤں والوں پر ظلم کرتا ہے اُسے گاؤں میں قدم رکھنے کا بھی حق نہیں ہے ــــــ؟ تارا کے رخسار سُرخ ہو گئے تھے۔

تمہارا مقصد یہ ہے کہ ــــ؟

گاؤں والوں کو چین سے جینے دیا جائے۔ غصب شدہ زمینیں واپس ہوں۔ بیگار کا سلسلہ بند ہو۔ سود در سود کے پھندے توڑ دئے جائیں۔ کاشت کاروں اور مزدوروں کو آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ جن کنوؤں کو نمبرداروں کی شرارت نے عوام کے لئے بند کر دیا ہے اُنھیں دوبارہ جاری کیا جائے۔؟

بس ــــــ کرن نے آہستہ سے کہا۔

بس، آپ کی سرکار سے اتنا بھی ہو جائے تو بہت کچھ ہے۔؟

اِس کے بعد ــــــ؟ کرن نے محبت بھری نگاہ ڈال کر پوچھا۔

تارا شرم کے مارے پانی پانی ہو گئی۔!

کرن نے اس کا چہرہ اونچا کیا تو آنکھوں میں آنسو تھے۔؟

تم تارا نہیں ہو دیوی ہو ــ؟

سچ سچ بتاؤ جو کچھ کہہ رہے ہو وہی کرو گے۔؟

تمہاری قسم ــــــ؟

میری جان سستی ہے نا ــــ؟ تارا نے شرارت سے کہا۔

کرن بلا تکلف مسکرانے لگا۔!

تارا بھی مسرور ہو گئی ——— !

کرن جب گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو تارا نے گھڑے میں سے گندھا ہوا ہار سنگھار نکال کر اُس کے گلے میں ڈال دیا۔

تارا باغ سے نکلی تو دل خوشی کے مارے رقص کر رہا تھا۔ چہرے سے خوشی پھوٹے پڑ رہی تھی۔ اور صحیح طور پر دوپٹہ اوڑھنے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ خراماں خراماں دو چار قدم چلی ہو گی کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ منہ پھیر کر دیکھا تو روپا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ تارا یکایک سہم گئی۔ لیکن فوراً ہی کسی خیال کے ماتحت شگفتہ ہو گئی۔

یہ کون تھے ——— ؟ روپا نے طنزیات سے کام لیا۔

زمیندار صاحب کے لڑکے۔ "کرن" ——— !

کیا کہہ رہے تھے۔ ؟

یہی کہ ہمارے گاؤں کو عنقریب پوری پوری سہولت دیں گے۔ اور پہلی سی لُوٹ مار روا نہ رکھیں گے ——— ؟ تارا کے فقروں میں اختیار کی بھی جھلک تھی اور اعتماد کی بھی۔

بوڑھے زمیندار کی موجودگی میں وہ اتنا بڑا کام کر سکیں گے۔ ؟

کیوں نہیں۔ وہ نوجوان ہیں۔ ترقی پسند۔ تعلیم یافتہ۔ اُن کی اُنگلیاں۔ اُن کے ارادے۔ اُن کے شانے سب مضبُوط ہیں۔ اور انصاف کے دروازے کھول دینے کی جرأت رکھتے ہیں۔

تم اُنھیں کب سے جانتی ہو ——— ؟ روپا شریر نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

تارا سٹپٹا گئی ——— !

اُس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔ اور انکھڑیوں کے ڈوروں میں دِل کی پنکھڑیاں ڈھونڈھنے لگی ۔ !

تارا نے تیکھی نظر سے دیکھا ۔ !

اور روپا نے اُس کے بازو میں چٹکی بھرلی ۔ !

ایک ہفتے بعد گاؤں میں ایک ایسا انقلاب آیا ۔ کہ گاؤں والے آپس میں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے ۔ اُنھیں یقین نہیں آتا تھا کہ زمیندار نے صِدق دلی سے پابندیاں اُٹھائی ہیں ۔ وہ اُسے بھی ستم کی کوئی نئی چال سمجھ رہے تھے ۔ زک اُٹھاتے اُٹھاتے ذہنوں پر افسردگی چھا چکی تھی ۔ لیکن جب زمیندار کے آدمی مایوس چہروں کے ساتھ رخصت اور جفا پیشہ نمبردار معزول ہوئے تو اُن کی آنکھیں کھلیں ۔ اور خوشی کے شادیانے بجائے جانے لگے ۔ چار دن تک وہ ناچ رنگ رہا ۔ کہ بڑے بوڑھوں کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ ایسا سماں عمر میں پہلی بار دیکھا گیا ہے ۔

چند روز کے شور و شغب کے بعد فرصت ملی اور لوگ کام کاج میں مصروف ہوئے تو اس تغیّر پر رائے زنی شروع ہوئی ۔ مختلف خیال تھے ۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ کہہ رہا تھا ۔ لیکن روپا نے دو چار پڑوسنوں سے جو بات کہی تھی وہ دو روز کے اندر اندر سارے گاؤں میں پھیل گئی تھی تارا ۔ تارا ۔ تارا ۔ چاروں طرف یہی نام لیا جا رہا تھا ۔ اور بوڑھے پٹواری کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کی داد دی جا رہی تھی ۔ جس طرف تارا گذر جاتی تھی لوگوں کی انگلیاں اُسی طرف اُٹھتیں اور نگاہیں بارِ احسان سے جُھک جُھک جاتیں ۔

پٹواری کے گھر نئے زمیندار کی برات آنے کا غلغلہ تھا۔ اپنے راجہ کی استقبال کی تن من سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تمام گاؤں دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ زمیندار کی طرف سے کوئی ہدایت تھی نہ پٹواری کوئی بڑا آدمی تھا مگر لوگوں کا بڑھا ہوا ذوق کام کر رہا تھا اور گھر گھر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ گاؤں کی بڑی چوپال جس میں برات ٹھہرنی تھی ہارسنگھاروں سے آراستہ کی گئی تھی اور زمیندار کے آدمیوں نے خاص ڈھنگ سے خود تزئین کی تھی۔ گاؤں والے حیران تھے کہ خوشبودار پھولوں کی بجائے ہارسنگھار کیوں پسند کئے گئے ہیں۔ لیکن اس راز کو رویا بھی نہیں جان سکی۔

کرن بڑے ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ آیا تھا۔ اور تین دن تک بڑی چہل پہل رہی تھی براتیوں کی سج دھج۔ گاؤں کے لوگوں کی آؤ بھگت۔ دعوتیں۔ خوشی اور خوشنودی۔ چوتھے دن برات رخصت ہوئی تھی اور سارا گاؤں دولھا دلہن کو پھولوں اور دعاؤں کی بوچھاریں نہر والے باغ تک چھوڑنے آیا تھا۔ شادی کی تقریب میں زمیندار کی طرف سے اس سال کی مال گذاری معاف کر دی گئی تھی اور گاؤں کا بچہ بچہ تارا کے گن گا رہا تھا۔

یہ سینکڑوں برس پہلے کی کہانی ہے۔ اب نہ تارا ہے نہ اس کا گھر۔ لیکن گاؤں میں کسی کا بیاہ ہوتا ہو تو عورتیں شگون کے طور پر تارا کا ایک گیت ضرور گاتی ہیں۔ سال کے سال گاؤں کی بڑی چوپال ہارسنگھاروں سے آراستہ کی جاتی ہے۔ اچھا خاصہ میلہ لگتا ہے اور گاؤں کی ہر خوشی میں تارا شریک سمجھی جاتی ہے۔

وہ دو سہیلیاں تھیں۔ نہایت حسین۔ قبول صورت۔ خوش وضع۔ خوش اندام۔ ایک ساتھ تعلیم حاصل کی جا رہی تھی۔ ایک ساتھ جیا جا رہا تھا۔ اونچے گھروں کی لڑکیاں تھیں۔ اونچے خیال تھے۔ اونچی باتیں۔ چہرے مُہرے بھی ایک سے تھے۔ راگ رنگ رہنا سہنا بھی ایک سا۔ طبیعتوں میں فرق ضرور تھا اور ہونا بھی چاہیئے تھا۔ خاندانی مزاج تقسیم ہونے والی چیز ہے۔ بچّوں کے ذریعہ بڑوں کی افتادِ طبع کا مظاہرہ ہوا کرتا ہے۔

جہاں آرا جس درجہ ناز و نزاکت کا شاہکار تھی۔ اُسی درجہ سنجیدہ اور شائستہ بھی۔ بڑوں کا

ادب تھا۔ بات کا قرینہ۔ ہر کام کا ڈھنگ۔ زبان میں نرمی۔ مُنہ پر بھولپن۔ گفتگو کا وہ انداز کہ زمانے کی رفتار بھی کچھ دیر کے لئے دھیمی پڑ جائے ——— لیکن راضیہ اس تصویر کا بالکل دوسرا رُخ جس قدر حسین۔ رنگ وروپ اور شان وشکوہ والی۔ اُسی قدر چٹاخ پٹاخ شوخ وشنگ۔ مورنی کی سی کھچاوٹ۔ راضیہ کا بس نہیں تھا ورنہ تتلی کی طرح شاخ شاخ اُڑی اُڑی پھرا کرتی۔

طبیعتوں کا اختلاف عموماً راستے بدل دیتا ہے۔ مگر وہ اس اختلاف ہی کی بدولت ایک دوسرے کے قریب تھیں۔ اور دن بدن زیادہ قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ جہاں آرا کو راضیہ کی شوخی۔ اس کا خلوص اور زندہ دلی پسند تھی۔ اور جہاں آرا کی نزہت۔ ہمدردی اور متانت پر راضیہ کی جان جاتی تھی ہر وقت ساتھ رہنے کی وجہ سے دل میں دل پڑ گیا تھا۔ عادتیں مِل جُل گئی تھیں۔ ساتھ کالج جاتی تھیں۔ ساتھ پھرتی چلتی تھیں۔ سیر وتفریح بھی ساتھ ہوتی تھی۔ خرید وفروخت میں بھی دونوں ساتھ رہتی تھیں۔ دن گذرتے گئے اور اُن کی محبت۔ ملاپ اور دلچسپی بڑھتی گئی۔

راضیہ ریشمی کپڑوں کا بکس ہاتھ میں لئے زمین کو ہلاتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ بکس پلنگ پر پھینک دیا۔ کرسی میں سماتے ہوئے اُس نے جہاں آرا پر نگاہ ڈالی تو اُسے ضرورت سے زیادہ متین اور کچھ مغموم سا پایا۔ راضیہ نے غم۔ حسرت۔ افسوس اور اس دنیا کی چیزیں کاہے کو دیکھی تھیں۔ حیران ہوگئی اور ہمدردی سے پاس بیٹھ کر ملال کا سبب معلوم کرنے لگی۔ جہاں آرا نے کسی قسم کا جواب نہیں دیا۔ راضیہ نے اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھا تو دائیں ہاتھ کے نیچے دوپٹہ کے آنچل کی اوٹ میں ایک خط نظر آیا۔ راضیہ کب چوکنے

والی تھی۔ بلا کہے سنے اُچک لیا۔ کوئی اور ہوتا تو اس بیہودگی پر لتّے لئے بغیر معاف نہ کیا
جاتا۔ پر اس کا نام راضیہ تھا۔ جہاں آرا کو دل مسوس کر خاموش ہو جانا پڑا۔
راضیہ نے بلا تکلف خط پڑھنا شروع کر دیا۔ چپکے چپکے پڑھتی جاتی تھی۔ دھیرے
دھیرے مسکراتی جاتی تھی۔ خط پڑھنے کے بعد اُس کی شرارت پُورے طور پر عود کر آئی۔ اور
اونچی آواز سے پھر پڑھنے لگی۔

اچّھی جہاں آرا ——— سلام شوق

میری پہلی غلطی وہ خط تھا جو دو ہفتے پیشتر ارسالِ خدمت کیا گیا ہے
یہ دوسری غلطی ہے۔ آپ جواب نہیں دیں گی۔ ایسا ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ زندگی
سچ مچ آپ کے پاؤں چھوتی ہو۔ دُنیا کا کونسا عروج اور اعزاز ایسا ہو جو آپ کو
حاصل نہیں ہو۔ مَیں زندگی کا مفہوم بھی نہیں جان سکا ہوں اُسے پانا تو بڑی
بات ہے۔ یقین جانیئے۔ خط لکھ کر دل کو سمجھایا کرتا ہوں ورنہ کہاں آپ
کی بلند حیثیت۔ کہاں میری شکستہ پائی۔ اس قسم کی بدعنوانیوں کے لئے
دیوانے معذور سمجھے جاتے ہیں۔ مَیں کم بخت تو اُن بدقماشوں میں سے ہوں
جو ہوش میں رہ کر بھی بیہوشوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ یہی باتیں سوچتے سوچتے
بہت سی راتیں کٹ جاتی ہیں۔ دیوانگی سی دیوانگی ہے۔ دیکھئے بُرا نہ مانیئے۔
بخدا میں مجبور ہُوں۔ نہیں تو آپ کو ہرگز تکلیف نہ دیتا۔
کاش مَیں کسی قابل ہوتا اور ذہنی کوفت دینے کی بجائے سکون کی
دُنیا پیش کرتا۔ میرے پاس صرف ایک جان ہو۔ آپ کی ذراسی خوشی کے لئے
یہ بھی نثار ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ اُس قصور کی تلافی ہو گئی جس نے آپ کو

میری قسمت کی طرح برہم کر دیا تھا۔

جہاں آرا۔ اُس برہمی کا خیال آتا ہے تو مَیں کانپ جاتا ہوں جی چاہتا ہے کہ شیرازۂ ہستی برہم کر ڈالوں۔ مگر ایک خلش ہی جو زندہ رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ شاید خدا کوئی ایسی گھڑی لے آئے کہ میں ہاتھ جوڑ کر پاؤں چُھو کر ایک لغزشِ پا کی معافی مانگ سکوں۔

(اسلم)

دوبارہ خط پڑھ کر راضیہ جیسی الھڑ لڑکی بھی ایک منٹ کے لئے بھاری بھر کم ہو گئی اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے دریافت کیا۔

پہلا خط کہاں ہے —؟

جہاں آرا دم بخود تھی۔ ہونٹوں پر خشکی۔ آنکھیں زمین پر جھکی ہوئی۔

کیا مصیبت ہے ———؟ راضیہ نے ذرا تیزی سے کہا۔

کچھ نہیں ———! اُس نے دبی زبان سے جواب دیا۔

میں پوچھ رہی تھی کہ پہلا خط کہاں ہے ———؟

جبھی پھاڑ ڈالا تھا ———؟

کیوں ———؟

اُسے رکھنا کیا ضرور تھا۔؟ آپ ہی آپ جہاں آرا کے دل میں کپکپی سی پیدا ہو گئی۔

چاہنے والوں کے خط یوں نہیں پھاڑا کرتے بنّو ———؟ راضیہ میں کوٹ کوٹ کر شرارت بھری ہوئی تھی۔

وہ پریشان خاطر تھی لیکن اُسے بھی ہنسی آگئی۔

سچ سچ جہاں آرا۔ یہ اسلم کون ہے ــــــ؟

جہاں آرا پھر سُن ہوگئی۔ وہ زبان سے ایک حرف نکالنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر کیا کرتی۔ بُری طرح پھنسی تھی۔

راضیہ نے کھٹ سے بازو توڑ لیا۔

بتاتی ہوں چڑیل کہیں کی ــــــ جہاں آرا نے بازو سہلاتے ہوئے تنبیہ کی۔

ہمارے دُور پرے کے رشتہ دار ہیں۔ مقامی ہائی اسکول میں سائنس ماسٹر ہیں۔ والدہ کے ساتھ اپنے چچا کے ہاں رہتے ہیں۔

سبحان اللہ۔ تلو۔ سوا سو کے سائنس ماسٹر۔ اور محبت فرما رہی ہیں جہاں آرا بیگم۔ راضیہ ہنسنے لگی۔

جہاں آرا کے ہونٹوں پر بھی تبسم آگیا۔

کہاں مُلاقات ہوئی تھی۔؟

کوثر آپا کی شادی میں۔!

اِس لغزشِ پا اور معافی تلافی کے کیا معنے ہیں۔؟

جہاں آرا اور راضیہ میں کمال بے تکلفی تھی اور بیچ میں کوئی پردہ بھی حائل نہیں تھا۔ مگر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے عرق عرق ہوگئی۔

رات کا وقت تھا۔ شادی کا گھر۔ چوتھی کا ہنگامہ۔ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ خوب چھینکم چھکیا ہو رہی تھی۔ ٹماٹر اُچھل رہے تھے۔ سنگتروں اور امرودوں سے مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ شمسہ اور شمشیر دونوں کی مجھ پر یورش تھی۔ مَیں اکیلی اور وہ دو دو۔ میرے دوپٹے پر ٹماٹروں کے نشان تھے اور سنگتروں کا رَس پڑا ہوا تھا۔ مَیں بھی موٹے موٹے کئی

امرود لے کر باورچی خانہ میں چھپ گئی کہ ان کم بختوں میں سے جو بھی نکلے گی اُسے نہال کرکے دم لوں گی۔ برابر کے کمرے سے آہٹ ہوئی۔ جونہی کوئی باہر نکلا میں نے ایک بڑا سا امرود تڑ سے رسید کیا اور جلدی سے اندر کو ہو گئی۔ چوٹ کھانے والا اُسی طرف کو آیا۔ مَیں سمجھی کہ شمسیہ ہوگی۔ ایک اور امرود ہاتھ میں لے کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن مجھے حیران ہونا پڑا۔ میرے سامنے اسلم کھڑے تھے۔ مَیں سٹپٹا گئی۔ اُن سے پردہ نہیں تھا۔ مگر سر تکھ ہو کر کبھی بات کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

جہاں آرا ——— ؟ اُن کی آواز میں نرمی تھی۔

میری آنکھیں شرم کے مارے جُھک گئی تھیں۔ !

اُنھوں نے میرا مُنہ اونچا کر دیا اور ...... ؟ جہاں آرا کہتے کہتے رُک گئی۔

خبردار۔ کہے جاؤ ——— ؟ راضیہ نے وارننگ دی۔

مَیں نے اُن کی طرف دیکھا تو انھوں نے میرے چہرے پر بکھرے ہوئے بال کانوں کے پیچھے کر دئے۔ اِس بیباکی پر مجھے غصّہ آگیا۔ اور مَیں تیوروں میں بل ڈال کر پیچھے ہٹ گئی۔

ناراض ہو گئیں ——— وہ گھبرا کر بولے۔

مَیں ایک دم باہر چلی گئی۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد مَیں نے اُنھیں پریشان پھرتے دیکھا۔ شاید مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔ لیکن میں شمشیر کے ساتھ اندر کمرے میں تھکی تھکائی بیٹھی تھی اور اُن کے اضطراب اور بے کلی سے آنے جانے کو دیکھ رہی تھی۔ صبح ناشتہ کے لئے بڑے کمرے میں گئی تو اُنھیں میز پر دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رات بھر پلک نہیں جھپکی ہے۔ چہرے پر کھنڈی

ہوئی سفیدی اور آنکھوں کی بے نوری شب کی بےچینی کا پتہ دے رہی تھی۔ دوپہر کو اوپر کمرے میں جاتے ہوئے اُن سے چار آنکھیں ہوئیں مجھے دیکھ کر ٹھہر گئے۔

جہاں آرا ایک بات سنو گی۔؟ اُن کی آواز میں سوز تھا۔

جی نہیں ——؟ میں دل برداشتہ تھی۔ سختی سے جواب دے کر چلی آئی۔

کوئی تین چار دن ہم سب رہے ہوں گے اس عرصہ میں وہ بہت ہی رنجیدہ دکھائی دئے لیکن پھر اُنھوں نے میرا راستہ روکا نہ کسی قسم کی بات چیت کرنے کی کوشش کی۔

تمھیں اُس پر کبھی رحم بھی آتا ہے ———— راضیہ نے فلسفیانہ لہجہ میں پوچھا۔

رحم و کرم کا سوال ہی نہیں ہے۔ ہاں چلتے وقت میں چاہتی تھی کہ اگر اب کے بات کرنا چاہیں گے تو اُنھیں یقین دلا دوں گی۔ کہ اُس بدعنوانی کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔؟

اب کیا گیا ہے۔ خط لکھا جا سکتا ہے ——؟

پگلی تو نہیں ہو گئی ——!

نہ بہن۔ جواب ضرور دینا چاہیئے۔ سنجیدگی سے نہ سہی ذرا حیران کرنیکے لئے ہی سہی۔؟

ہرگز نہیں۔ خدا کے لئے تم اپنا مذاق رہنے دو۔ جہاں آرا نے ڈر کر کہا۔

خط میرے ہاتھ میں ہے پھر جواب دینے نہ دینے کا اختیار مجھے ہے یا تمھیں۔؟ راضیہ نے بچّوں کی طرح چڑاتے ہوئے کہا۔

جہاں آرا نے اُس سے خط چھیننا چاہا۔ مگر وہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

دو دن تک راضیہ کا پتہ نہیں چلا۔ جہاں آرا فکر مند تھی۔ اور ڈر رہی تھی کہ راضیہ کی شرارت کوئی نیا گل نہ کھلا دے۔ جی نہیں چاہتا تھا مگر خود اُس کے ہاں جانا پڑا اسے دیکھتے ہی راضیہ مُسکرائی۔

بہت ستا چکیں۔ بس اب خط واپس کر دو ——؟

راضیہ نے ٹرنک سے خط نکالا اور دونوں ہاتھوں پر رکھ کر ادب سے پیش کر دیا۔ !

جہاں آرا نے اُسے کھولا تو پیشانی پر سُرخ سیاہی سے لکھا ہوا تھا "جواب دیدیا گیا" ؟

راضیہ ہر بات میں مذاق اچھا نہیں ہوتا۔ آدمی کو کبھی کبھی آدمی بھی بنجانا چاہیئے۔ ؟

جہاں آرا برس پڑی۔

کیا لکھو گیا ہی بہن ——؟ راضیہ ہنسی ضبط کر رہی تھی۔

تمھارا سر۔ تمھارے دیدے۔ کالا مُنہ۔ نیلے ہاتھ پاؤں۔ ؟ جبینِ ناز پر گہری شکن تھی۔

راضیہ نے کئی بار ہاتھ پکڑا۔ بہتیری خوشامد کی۔ مگر جہاں آرا نے ایک نہ سُنی اور غصے میں بھر کر چلی گئی ——————

وہ سارا دن منہ لپیٹے پڑی رہی۔ اُسے غم بھی تھا۔ سہم بھی تھا۔ ملال بھی تھا۔ خدا جانے راضیہ نے کیا کچھ لکھ دیا ہوگا۔ ستم در ستم یہ کہ وہ رُوٹھ کر آئی تھی اور اُس سے معلوم کرنے کا موقع ہی رہا تھا نہ معلوم کئے بغیر چین آتا تھا۔ دن بھر ہولتی رہی۔ شب کو بھی اطمینان سے نہ سو سکی۔ کبھی بدنامی سے خائف۔ کبھی بات بڑھنے کا اندیشہ۔ وہ کسی قسم کی بلا مول لینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ دن یونہی گذرتے رہے اور جہاں آرا کا فکر دُور ہوتا گیا۔ ایک ہفتہ بعد وہ خط اور اس سے پیدا ہونے والے خطرے بھُول چکی تھی۔ لیکن راضیہ سے ملنے کی جو اُمنگ پہلے

دن پڑی تھی وہ کئی ہفتے تک جاری رہی۔ وہ خود اُس کے ہاں گئی نہ اُسے اپنے ہاں بُلایا
کالج میں روزانہ مڈبھیڑ ہوتی تھی۔ مگر چُپکے چُپکے مُسکرانے کے سوا دونوں میں بولنے بات
کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ مگر یہ لڑائی دو محبت بھرے دلوں کی لڑائی تھی بس وہی
جانتیاں تھیں کہ ہم لڑ رہے ہیں کسی تیسرے کو معلوم نہ تھا کہ واقعات کیا ہیں اور آجکل
یہ الگ الگ کیوں رہتی ہیں۔

جہاں آرا کالج جانے والی تھی کہ پوسٹ مین نے آواز دی اور ملازمہ نے ایک خط
لاکر اُس کے ہاتھ میں دیدیا۔ پتہ پڑھتے ہی بھیجنے والے کا نام جہاں آرا کے ذہن میں آگیا تھا
اور وہ اس خط کو ایک کتاب میں رکھ کر جلدی سے روانہ ہوگئی تھی۔ راستے میں اُسنے ڈرتے
ڈرتے کھولا اور بے صبری سے پڑھنا شروع کردیا۔

اس نے لکھا تھا:۔

جہاں آرا ـــــــ بہت بہت سلام۔ بہت سی دُعائیں۔

عنایت نامہ وصُول ہوا۔ اِس کا ایک ایک حرف میرے دل۔
دماغ اور روح نے پڑھا ہے۔ رسمی نہیں دلی شکریہ قبول فرمائیے۔
آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ پہلی چیز آج سے چوتھے دن پہنچ جائے گی۔
دوسرے حکم کی تعمیل میں دو ہفتے ضرور لگیں گے۔ مگر راقم الحروف کی کوشش
یہی رہے گی کہ پہلی فرصت میں وہ خدمت انجام دے دی جائے زندگی
میں یہ پہلا دن ہے کہ میں اپنے آپ کو انسان کہنے کے لئے تیار ہوا ہُوں
ایک بے یار و مددگار آدمی کو جینے کا سہارا مل جاتا ہے تو وہ تنہا خوشیاں
نہیں مناتا اُس کے ساتھ آسمان و زمین اور پُوری کائنات جھومنے لگتی ہے۔

سچ جانئیے یہ آسمان کے ستارے، سبز سبز ٹہنیوں کے پھُول اور
پچھلی رات کے آنسو کانپ کر دردمند دلوں اور محبّت بھری جوانیوں
ہی کو اشارے کیا کرتے ہیں۔ یہ محبّت کے امین ہیں اور صحیح طور پر رہنمائی
فرماتے ہیں۔

اسلم

جہاں آرا خط پڑھ کر ششدر رہ گئی۔ جس معمّے کو حل کرنے کے لئے وہ ہفتوں غلطاں پیچاں رہی تھی وہ بدستور معمہ ہی رہا اور پہلے سے بھی زیادہ تشویشناک ثابت ہوا۔ پہلا حکم۔ دوسرا حکم۔ اُسے وحشت سی ہونے لگی اور وحشت کے ساتھ راضیہ کو کاٹ کاٹ ڈالنے کے لئے جی چاہنے لگا۔ اچھی فضا کو سوگوار اور جیتی جان کو جھوراگا کر اپنے مرے جیتوں کو ثواب پہنچا گئی تھی۔

جہاں آرا روزانہ صبح کو ملول اٹھتی تھی اور دن بھر خیالی کشمکش میں مبتلا رہتی تھی اس ہولاجولی نے پھُول سے چہرے کو کسی قدر کُملا دیا تھا۔ اور وہ اُس نازنین کی طرح دکھائی دینے لگی تھی۔ جسے کتے جاڑے موسمی بخار نے گھیر لیا ہو۔ ٹھیک چوتھے روز سہ پہر کو وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ مُلازمہ نے ایک چھوٹا سا رجسٹرڈ بنڈل لاکر دیا۔ جہاں آرا نے سکتے کے عالم میں چِٹ پر دستخط کئے اور دو منٹ تک بے حس و حرکت بنڈل ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔ پھر ٹھنڈا سانس بھر کر اُسے کھولا۔ اندر موتیوں کا ایک خوشنما ہار تھا۔ اور ایک چھوٹا سا پرچہ۔ جس پر صرف اسلم لکھا ہوا تھا۔ جہاں آرا نڈھال سی ہوگئی۔ دِل اور دماغ۔ نظر اور روح سارے کے سارے سُن ہوگئے تھے۔ کچھ دیر بعد آنچل سے آنسو پونچھ کر اُس نے ہار اپنے ساتھ لیا اور بلا سوچے سمجھے راضیہ کے پاس پہنچ گئی۔

ہار دیکھ کر وہ شوخ تیتری بھی حق دق رہ گئی۔

ہاں بہن یہ میری غلطی تھی۔!

آخر تم نے لکھا کیا تھا ——؟

در اصل میں یہ سمجھی تھی کہ اسلم بھی آج کل کے نوجوانوں کی طرح سطحی جذبات کا پتلا ہوگا۔ رسمی محبت ہو گی۔ رسمی الفاظ۔ آہیں۔ اور آنسو۔ اگر کسی قسم کا بارڈالکر ایثار کا مطالبہ کیا گیا تو وہ معمولی حیثیت کا آدمی اپنے آپ خاموش ہو کر بیٹھ جائے گا۔؟ راضیہ کی آواز بھاری پڑ گئی تھی۔

یہ محل تھا یا نہیں تھا لیکن جہاں آرا کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔!

تم سے خط لیکر میں نے ان کے حالات دریافت کئے تو معلوم ہوا کہ ایک سو پانچ تنخواہ ملتی ہے۔ فلسفی کا سا دماغ پایا ہے۔ شاعر کا سا دل۔ سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی عادت ہے۔ بہت دنوں سے سائنس پر کوئی کتاب لکھ رہے ہیں جس پر آئندہ ترقی کا دارو مدار ہے۔ میں نے دکھتی رگیں پکڑی تھیں۔ اور لکھا تھا کہ "تمھیں معاف کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان شرائط پر کہ سچے موتیوں کا ایک ہار جرمانے کے طور پر پیش کیا جائے۔ اور وہ سائنس کی کتاب، میرے نام سے چھاپی جائے۔ اگر تمھارے الفاظ میں صداقت ہو گی۔ تو دونوں باتیں پوری کی جائیں گی۔ ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم بھی اُنھی لوگوں میں سے ہو محبت جن کے پاس ہو کر بھی نہیں گذرتی" —— راضیہ چُپ ہو گئی۔

جہاں آرا کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

اب کیا ہو گا۔ وہ کتاب میرے نام سے چھپ گئی تو ——؟

راضیہ کیا جواب دیتی۔ کھیل بگڑ چکا تھا۔!

وہ چُپ چاپ اُٹھ کر چلی آئی ——— !

اپنے کمرے میں جہاں آرا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی مسلسل سوچ رہی تھی۔ مگر اُلجھے ہوئے دماغ میں سُلجھی ہوئی کوئی بات نہیں آتی تھی۔ بدنامی کا کھٹکا تھا۔ بات بگڑنے کا صدمہ۔ اچانک اُس کی نظر اسلم پر پڑی۔ وہ اس کا غمگین چہرہ۔ ذراسی بات پر اتنا تاسف۔ ہاتھ جوڑ کر پاؤں چھُو کر معافی مانگنے کی تمنّا۔ پھر راضیہ کے مطالبہ پر جوابی خط اور موتیوں کا ہار۔ ؟ ؟ ؟ جہاں آرا بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ بہت حسین۔ بہت پُر تمکین۔ مگر سب کچھ ہونے کے باوجود پھُولوں بھری جوانی کا مجسمہ تھی۔ پہلو میں نسوانی دل تھا۔ نگاہیں جُھک جُھک گئیں۔ شاید وہ اپنے دل سے دِل کی باتیں کر رہی تھی۔ بیکلی بھی کارفرما تھی جذبات بھی ناز فرما۔ اُس سے بیٹھا نہ رہا جا سکا آہستہ آہستہ کمرے میں پھرنے لگی۔ موتیوں کا بیش قیمت ہار سیدھے ہاتھ کی چار انگلیوں پر تھا اور نگاہیں ہار پر۔ اُسے موتیوں کی چمک میں وہ دُبلا پتلا خوبصورت نوجوان نظر آنے لگا۔ دل آپ ہی آپ نرم پڑ گیا۔ اور آنکھوں سے موتی گِر گِر کر ہار کے ایک ایک موتی کو دل بنانے لگے۔ اب ہار جہاں آرا کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ کلیجے سے لگا ہوا تھا۔

اسلم نے جہاں آرا کی پیشانی پر بِکھرے ہوئے جو بال دھیرے سے کان کی لَو پر ڈال دئے تھے اُن میں اُس کا دل اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ لیکن جب وہ ناراضگی سے پیچھے ہٹی ہے تو اسلم کا جی ہی جانتا ہو کہ اُس پر کیا بنی تھی۔ اُس نے معذرت کے لئے روکنا بھی چاہا تھا مگر حُسنِ برہم کو روکنا آسان کام نہیں تھا۔

اُس کے بعد اسلم جہاں آرا کے ساتھ پھرتا رہا لیکن اُس نے تمکنت سی اسلم کی طرف

دیکھنے کی ضرورت سمجھی نہ کچھ کہنے سُننے کا موقع دیا۔ بات کرنے کا اتفاق بھی ہوا تو بھی رُخ دے کر بات نہیں کی۔ اور اُلٹا دِل پیروں سے مسل کر چلی گئی۔

اِس واقعہ نے اسلم کے دل میں اور بھی آگ لگا دی۔ اوّل تو جہاں آرا سے دوچار ہونا ہی کچھ کم حادثہ نہیں تھا۔ پھر آن کی آن میں دل کی بربادی نے اور بھی ہوش اُڑا دیئے۔ وہ پشیمان سا رہنے لگا۔ جہاں آرا کوئی معمولی لڑکی تو نہیں تھی۔ دولت مند والدین کی آنکھوں کا نور۔ کلیجے کی ٹھنڈک۔ پانچوں اُنگلیاں پانچوں چراغ۔ خود اُس کے ہاں جانے کا امکان تھا نہ اُسے اپنے ہاں بُلانے کا۔ اسلم بہت عرصے تک پریشان رہا تھا۔ اور ایک لمحے کے لئے بھی جہاں آرا کی یاد دل سے نہیں گئی تھی۔ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس نے خط کے ذریعہ التجائیں کیں۔ یہ دوسرا خط تھا جسکے جواب میں راضیہ نے نیا شگوفہ کھلایا تھا۔

اسلم خوش رو۔ خوش پوش۔ خوش خیال نوجوان تھا۔ اور اُس نے رسم و رواج سے بلند ہو کر جہاں آرا سے محبت کی تھی۔ اُس کے فکر و نظر کی بلندی جوابی محبت کی بھی حامی نہیں تھی۔ اور اسلم صرف یہ چاہتا تھا کہ رُوٹھی ہوئی جہاں آرا کسی طرح مَن جائے۔ پھر تصوّر کے سہارے جینا اُس کا کام تھا۔ اس مقصد کے لئے وہ جان تک دینے کے لئے تیار تھا۔ باقی چیزیں کس شمار میں ہیں۔

جس دِن جہاں آرا کا خط ملا ہے۔ اسلم کے پاس گنتی کے پچاس ساٹھ روپے تھے۔ کہاں یہ چھوٹی سی پونجی کہاں بیش قیمت ہار کی مانگ۔ وہ بہت سٹپٹایا سہما سمٹا اور گھبرایا۔ کسی بڑی رقم کا جلدی فراہم کرنا مشکل تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد اسکی آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی بجلی کی سی سرعت کیساتھ اُٹھا اور الماری میں سے کاغذات کا بنڈل نکال کر بازار روانہ ہو گیا۔

پبلشر نے محمد اسلم ایم۔ایس۔سی کو بڑے غور سے دیکھا۔اور چیک دیکر کتاب کا مسودہ اپنی دراز میں رکھ لیا۔اسلم کے جانے کے بعد پبلشر اطمینان سے بیٹھا تو اُسے سخت تعجب تھا کہ یہ ذہانت کا پتلا تین ماہ پیشتر پانچ ہزار میں ایک مرتبہ کے لئے حقِ اشاعت دینے پر راضی نہیں تھا۔پانچ ہزار میں دائمی حقوق کیسے دے گیا۔پھر ستم یہ کہ اتنی معرکہ کی کتاب اپنے نام کی بجائے کسی عورت کے نام سے چھپوائی جا رہی ہے۔یہ سب سوچنے کی باتیں تھیں۔مگر پبلشر کو دو ہفتے میں چاندی ہی چاندی نظر آرہی تھی۔اس طرف تھوڑی سی توجہ دینے کے بعد وہ اپنے نفع کی بابت سوچنے لگا۔اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے عینک اُتار کر دامن سے صاف کر رہا تھا۔

ہارمیش کرنے کے بعد اسلم کو جینے کی آس بندھ چکی تھی۔زندہ رہنے کی آرزو جو کچھ دِنوں پہلے سسکیاں لے کر دم توڑ رہی تھی۔دوبارہ جوان ہو چُکی تھی۔پبلشر کو خود ہی کتاب چھاپنے کی جلدی تھی۔اسلم کے اصرار نے اور بھی سرگرمی کے ساتھ کام کرنے کی رُوح پھونک دی۔پبلشر نے دنیا دیکھی تھی۔پرلے درجے کا ہوشیار آدمی تھا۔اُس نے کاپیاں پڑھنے اور پروف دیکھنے کی ذمہ داری بھی اسی کے سپرد کی۔اور اُس نے خوشی خوشی قبول کر لی۔کتاب تیار ہو رہی تھی اور اسلم کا شوق پہردوں بڑھ رہا تھا۔

ایک روز سکول جانے سے پہلے وہ پروف پڑھ رہا تھا کہ اُسے خوشنما سا ایک لفافہ مِلا جس کی پشت پر جہاں آرا کا نام چھپا ہوا تھا۔اسلم کی باچھیں کھِل گئیں اُس نے جنت کی بشارت پائے ہوئے انسان کی سی مسرت کے ساتھ خط کھولا اور ایک طرح کی خوشی اور خوف کے عالم میں پڑھنے لگا۔اُس جانِ بہار نے لکھا تھا۔

اسلم صاحب ——— سلام مسنون

آپ کے دو خط اور ایک ہار وصول ہوا۔ دوسرا خط اتفاق سے میری ایک شریر سہیلی کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اُس ستم ظریف نے آپ کو ستانے کی غرض سے ہار اور کتاب کا مطالبہ کیا تھا۔ ہر چند کہ اس شرارت میں میرا حصہ نہیں تھا پھر بھی کسی نہ کسی حد تک میں بھی ذمہ دار ہوں۔ اور اس شرارت کے لئے معافی چاہتی ہوں۔

موتیوں کا ہار خریدا جا چکا ہے۔ اس لئے واپس کرنا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قیمت ادا کر دی جائے۔

پہلے مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تھی یا آپ سے۔ بہرکیف بھول جانا چاہیئے۔ جب قصور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو معافی تلافی کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

والسلام

جہاں آرا

اسلم نے ایک بار نہیں کئی بار خط پڑھا اور دل و دماغ میں تازگی سی پائی۔ اسے خواب میں بھی خیال نہیں تھا۔ کہ جہاں آرا کبھی التفات سے پیش آسکتی ہے۔ بظاہر خط کی پوری تحریر بے تعلقی کا اظہار کر رہی تھی۔ مگر لاکھ بے تعلقی کے باوجود ایک طرح کا گہرا تعلق لفظوں اور سطروں میں جھلک مار رہا تھا۔ اسلم نے اطمینان کا سانس لیا۔ قلب میں خوشی کی لہر پیدا

ہوئی۔ ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اُسے یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ خانہ بر اندازِ چمن اُس کی باہوں میں گم ہو کر رگ و پے میں سما چکی ہے۔ جہاں آرا کا سر اس کے سینے پر ہے۔ اُس کے ہاتھ حسین زندگی کے حسین دائرے میں۔ اور اس وقت وہ ایسے دست و بازو کا مالک ہے جنھیں نظر نہیں لگا کرتی۔

اسلم کلاس میں تھا بھی اور نہیں بھی تھا۔ اس کا خیال۔ اس کا دل اور رُوح کسی چاند سے شگفتہ چہرے کی بلائیں لے رہے تھے۔ خط کا جواب سوچا جا رہا تھا۔ جذبات کی یورش تھی۔ تمناؤں کا ہجوم۔ جی چاہتا تھا کہ کہنے کی تمام باتیں کہہ دی جائیں۔ لیکن محبت کی بکھیر کاغذی صفحے کو صفحۂ دل بناتے ہوئے ہچکچاتی تھی کہ کہیں اس تاروں بھری پیشانی پر شکن نہ پڑ جائے۔ کئی خط لکھے تھے اور پھاڑ پھاڑ ڈالے تھے۔ عقل ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اسلم حیران تھا کہ کس انداز سے لکھا جائے۔ نکتہ چینی کا ڈر بھی تھا۔ بات بنانے کی دُھن بھی تھی۔

سارا وقت ذہنی انتشار میں گذر گیا اور چھٹی کا گھنٹہ بجتے ہی اسلم اپنے مکان پر آگیا اب وہ تھا اور اس بہار آفریں دوشیزہ کا تصور جس کی محبت نے جنت کی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ جہاں آرا جتنی حسین تھی اُس سے کہیں زیادہ اُس کا تصور حسین تھا اسلم شام تک کرسی پر بیٹھا نہ جانے کیا کیا کچھ سوچتا رہا۔ مگر کوئی بات دل پر نہیں جمی۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک بوڑھی عورت اُس کے کمرے میں داخل ہوئی اور ادب سے سلام کر کے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اسلم نے دل ہاتھ میں رکھ کر وصول کیا اور نگاہوں سے چُوم کر کھولا تو اس میں سے خالی دستخط کیا ہوا ایک چیک نکلا جس پر روپیہ پانے والے کا نام درج تھا نہ رقم بھری ہوئی تھی۔ وہ خاموش رہ گیا۔

یہ چھوٹی بی بی نے آپ کو بھجوایا ہے -!

آپ اُن کی ...... ؟

جی، آتا ہوں ——!

زبانی بھی کچھ کہا ہے - ؟ اسلم کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا -

جی نہیں - !

دیکھئے آپ یہ اُنھیں واپس دیدیجئے - اس کے ساتھ میں ایک پرچہ اور لکھے دیتا ہوں - ؟

لیکن میاں وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں - ؟

گھر پر نہیں ہیں —— ؟

جی ہاں - یہ لفافہ جس وقت میرے سپرد کیا گیا ہے وہ اپنی چچی اماں کے ہاں جارہی تھیں - !

ڈپٹی صاحب کے ہاں —— ؟

جی —— !

بڑھیا چلی گئی اور وہ لفافہ میز پر رکھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ "ڈپٹی صاحب کے ہاں"۔ اسلم کی نگاہوں میں کوئی راز کھیل رہا تھا - جہاں آرا کی چچی اماں اس کی بھی تو خالہ بیوی تھیں - بہت کچھ دور اندیشے سامنے آئے عقل نے دامن پکڑا - اپنی دنیا اجازت نہیں دے رہی تھی - لیکن دل کی تڑپ سب پر غالب آئی - وہ بیخودی کے ساتھ جہاں آرا کی طرف کھنچا جارہا تھا -

اسلم ڈپٹی صاحب کے ہاں پہنچا تو کھانا کھایا جارہا تھا - اُسے دیکھتے ہی خالہ بیوی

خوش ہوگئیں۔

اسلم میاں کھانا تیار ہے۔؟

میں تو ابھی ابھی کھانا کھا کر آرہا ہوں۔!

جھوٹ۔؟

سچ کہتا ہوں۔!

تھوڑا بہت میرے کہنے سے سہی۔؟

مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ لیکن اُسے جگہ کہاں ملی جہاں آرا کے سامنے والی بڑی کُرسی پر —!

اسلم کی بھوک اُڑ گئی تھی۔!

جہاں آرا کے ہاتھ قابو میں نہیں تھے۔!

کھانے کے بعد جہاں آرا نے اس کی طرف دیکھا۔ اسلم کانپ گیا۔

ڈپٹی صاحب کی دونوں لڑکیاں اور جہاں آرا اوپر چلی گئیں۔

اسلم خالہ بیوی کے پاس تخت پر بیٹھ گیا۔

گھڑی گھڑی اس کی نگاہ اوپر جاتی تھی مگر وہ رُخِ زیبا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اوپر ہوا میں بیٹھو میاں۔ میں بھی نماز پڑھ کر آتی ہوں۔ چلے نہ جانا مدّت کے بعد آئے ہو۔ وہ شفقت کے ساتھ بولیں۔

اسلم اوپر جانے لگا۔ زینے کے موڑ پر کسی کے نیچے اُترنے کی آہٹ ہوئی۔ بڑی سیڑھی پر اس نے قدم رکھا ہے تو جہاں آرا اُس کے سامنے تھی۔ یہ بھی حیران۔ وہ بھی ششدر۔ کوشش تھی نہ ارادہ۔ محبّت کی کشش غیر مرئی طور پر کھینچ لائی تھی۔

چند لمحے دونوں کاغذکی تصاویر بنے رہے۔ بُری طرح جکڑے گئے تھے۔ زمین بھی ہنس رہی تھی۔ آسمان بھی مُسکرا رہا تھا۔ زبانیں چُپ۔ نگاہیں چُپ۔ صرف دلوں کی دَھک دَھک سُنی جاسکتی تھی۔

جہاں آرا ــــــ؟

اُس نے نیچی نگاہ سے اونچی نہیں کی۔ پیشانی پر شرمگیں موتیوں کی قطار لگ گئی تھی

ایک بات سُن لیجئے ــــ؟ اسلم کی التجا دردِ دل کی امین تھی۔

جہاں آرا نے چہرہ اوپر کیا تو اتّفاق سے بالوں کی ایک لٹ منہ پر بکھر گئی۔

اسلم کا جی لوٹ گیا۔ اُس نے بلا سوچے سمجھے پیار سے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر بالوں کو سر پر جما دیا۔! لیکن ہاتھ ہٹاتے ہی پہلی فروگذاشت کا خیال آگیا۔ اس کا رواں رواں کانپ گیا۔

اُس کی نگاہیں پھر جھک گئیں۔!

اسلم گھبرایا اور اپنی جگہ سنبھل گیا کہ وہ جانا چاہے گی تو راستہ روک لے گا۔!

جہاں آرا گُم سُم تھی۔

مجھ سے پھر بھول ہو گئی۔ اسلم اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

جہاں آرا نے تیکھی نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔

اور اسلم نے جھک کر اُس کے پاؤں چھُو لئے۔

جہاں آرا سہم گئی۔

ہمیں یہ باتیں پسند نہیں ہیں۔؟ وہ حاکم کی سی شان کے ساتھ بولی۔

اب ایسی غلطی کبھی نہیں ہو گی۔؟ اسلم نے اس قدر لجاجت سے کہا کہ جہاں آرا

کو بھی رحم آگیا۔

آپ نے کتاب رُکوادی ہوگی ——— جہاں آرا کی آواز میں نرمی تھی۔

جی نہیں۔ وہ تو عنقریب شائع ہو رہی ہو۔ ؟

دیکھئے۔ یہ میری سہیلی راضیہ کی شرارت تھی۔ آپ اُسے شائع نہ کریں۔ ؟

اسلم کی نظریں نیچی ہوگئیں۔

کتاب ایک پبلشر کو دیدی گئی ہو۔ وہی طبع کرائے گا۔!

کیا مطلب ——— ؟

حقوق تصنیف فروخت کردئے گئے ہیں۔!

کیوں ——— ؟

اسلم چُپ رہ گیا ——— !

کتنی رقم لی گئی ہے ——— ؟

پانچ ھزار ——— !

جہاں آرا سب کچھ سمجھ گئی ——— !

ایک بات مانیں گی ——— ؟

کہیئے ——— ؟

اسلم نے جیب سے چیک نکال کر سامنے کردیا۔

خدا کے لئے اسے واپس لے لیجئے ——— ؟

ایسا نہیں ہوسکتا۔ ؟ جہاں آرا نے فقرہ ادا کرتے وقت ناز سے گردن کو جنبش دی تو دوپٹہ کا آنچل سر سے کِھسک گیا۔ اور پھر کچھ بال مکھڑیوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگے۔

اسلم کی میٹھی میٹھی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں لیکن دل مسوس کر رہ جانا پڑا۔
جہاں آرا نے جلدی سے آنچل سر پر ڈال لیا۔
زیادہ شرمندہ نہ فرمایئے۔ مَیں کس قابل ہوں کاش...... اسلم سے آنسو نہ روکے جا سکے۔
آخر آپ پر بار کیوں ڈالا جائے۔؟
بار۔؟ کیا فرما رہی ہیں۔؟
بار کیوں نہیں۔ سالہا سال کی محنت پر خاک ڈال کر پانچ ہزار حاصل کئے اور وہ بھی........؟
ایسا نہ کہیے۔ آپ کی عنایت ہو گی تو ایسی ایسی دس کتابیں لکھ لی جائینگی؟
اسلم نے ٹھنڈا سانس بھرا۔
بہرحال نہ ہم ہار واپس دیں گے نہ بغیر قیمت دئے لیں گے۔؟ جہاں آرا کے لب و لہجہ میں کس درجہ اپنایت تھی۔
اسلم سوچ میں پڑ گیا۔
کیا سوچ رہے ہیں ———؟
یہی کہ جب قیمت ہی لینی ہے تو پھر مُنہ مانگی کیوں نہ لی جائے۔؟
بیشک ———!
اسلم نے بلا تکلف اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور چاندی کا خوشنما چھلا انگلی میں گھما کر آہستہ سے کہا۔ معاوضہ میں یہ عطا فرما دیا جائے۔
جہاں آرا کی نگاہوں میں محبّت جھُوم جھُوم گئی۔ اُس نے پیار سے اسلم کے سیدھے

ہاتھ کی چھنگلی میں وہ چھلا اس طرح ڈال دیا۔ جیسے کوئی بے اختیار ہو کر گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے۔

چھلے کی اس لوٹ پھیر میں جہاں آرا کے سر سے پھر دوپٹہ ہٹ گیا اور بے ترتیب بال مکھڑے کی بلائیں لینے لگے۔

جہاں آرا نے آنچل سر پر ڈالنے کے لئے ہاتھ اُٹھایا لیکن اسلم نے آہستہ سے ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ گویا وہ نگاہوں کے ذریعہ صاف صاف کہہ دینا چاہتا تھا کہ انھیں یونہی رہنے دیجئے۔ ہم خود درست کریں گے۔ اور اگر آپ ضد کریں گی تو بال سنوارنے کے ساتھ ساتھ پیشانی بھی چُوم لی جائے گی۔

جہاں آرا شرم کے مارے سُکڑی جا رہی تھی۔ !

اسلم کا ذوق ترقی کر رہا تھا۔

اچانک خالہ بیوی نے نماز پڑھ کر اسلم کو آواز دی۔ دونوں گھبرا گئے۔ اسلم دَبے دَبے پاؤں اوپر چلا گیا۔ اور جہاں آرا کھٹاک سے نیچے اُتر آئی۔

دونوں اپنی اپنی جگہ سرشار تھے۔ ایک دوسرے کو دعائیں دی جا رہی تھیں۔ شاید وہ خوشیاں نہیں منا رہے تھے اُن کے دل خوشیاں منا رہے تھے۔

خالہ بیوی سے باتیں کرنے کے بعد اسلم نیچے آیا تو جہاں آرا کو اپنا منتظر پایا۔ اُس نے کمال دلنوازی کے ساتھ پان دیا۔ اور اُس نے قدرے سر جھکا کر قبول کر لیا۔

اسلم جانے لگا تو چوکھٹ نے اُس کے پاؤں پکڑ لئے ——!

جہاں آرا کی نظر کانپ رہی تھی۔ !

کل آئیے گا —— رفتہ رفتہ حجاب اُٹھ رہا تھا۔

آنکھوں سے ـــــ اسلم کے دو لفظوں میں زندگی کی پوری داستان پوشیدہ تھی۔

جہاں آرا اور راضیہ دونوں آمنے سامنے تھیں۔ اور خوب کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔

ہزار چڑیلوں کی ایک چڑیل ؟

چڑیل سے بات کیوں کی جا رہی ہے۔؟

ہمارے پاس ایسا منتر ہے کہ چڑیلیں اور بھتنیاں بھی رام ہو جاتی ہیں۔؟

دیکھوں۔؟ راضیہ نے تھوڑی پکڑ کر منہ اونچا کر دیا۔

جہاں آرا نے نظریں چُرا لیں۔

آخر میں کہوں کیا ـــــ ؟

وہی جو ابھی بتایا گیا ہے۔؟

جیسے میری بات مان ہی لی جائے گی۔؟

کیوں نہیں۔ امّاں جان تجھے میری طرح چاہتی ہیں۔؟

مقصد یہ ہے کہ محبت فرمائیں آپ اور بلائیں سر لُوں میں۔؟

جس نے خط کا جواب لکھا تھا وہی یہ سوال بھی حل کرے گا۔؟

خواہ مخواہ محبت کر ڈالنے کی درخواست کس نے کی تھی۔؟

تُم نے۔؟

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑیں۔

سائنس کے متعلق اسلم کی کتاب پوری شان و شوکت کے ساتھ شائع ہوئی۔ تصنیف

پر اُسی کا نام تھا۔ مگر پہلے صفحہ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "شریکِ زندگی کے نام"۔ کتاب علمی طبقوں میں بے حد پسند کی گئی۔ مقتدر اخبارات و رسائل نے حوصلہ افزا ریویو کئے تھے اور اسلم کی فنّی لیاقت کو سراہا تھا۔

اب جہاں آرا کی مانگ ہر وقت پھولوں سے بھری رہتی تھی۔ اسلم سائنس ماسٹر سے سائنس داں بن چکا تھا۔ نئی زندگی تھی۔ زندگی کا نیا دَور لیکن دونوں میاں بیوی ٹھیک پہلے جیسے محبّت والے اسلم اور جہاں آرا تھے۔ دن میں کئی کئی بار لڑنا بھڑنا اور گھُل مِل جانا۔ اب بھی جہاں آرا اگر بگڑ جاتی تھی تو اسلم سچ مچ ہاتھ جوڑ کر پاؤں چھُو کر مناتا تھا۔ رُوٹھنا اور منانا ہی اُن کی زندگی تھی۔ محبّت نے اُنھیں ایسے بندھن میں باندھ کر چھوڑا۔ جسے موت بھی چپکے چپکے اِس طرح کھولے گی کہ محبّت کو خبر نہ ہونے پائے۔

کہتے ہیں جو انقلاب محبّت برپا کرتی ہے اُسے فطرت بھی مُسکرا کر قبول فرما لیتی ہے۔

کرشن ــــــ ایک نوجوان ۔ دَولت اور جوانی کے نشے میں شرابور۔ آج کے ترقی پسندوں سے زیادہ ترقی پسند۔ مذہب سے بغاوت۔ سماج سے بغاوت۔ پُرانی باتوں رسموں رواجوں سے سو فیصدی چِڑ۔ دولت کا دھنی۔ دولت کی مساوی تقسیم کا حامی۔ زبان میں رَس تھا اور اِس غضب کی باتیں ڈھایا کرتا تھا کہ معمُولی سمجھ بوجھ کا آدمی مرعوب ہوئے بغیر نہ رہتا۔ پیسے کی زیادتی اور زبان کی طراری نے ضرورت سے زیادہ گستاخ کر دیا تھا اور صبح کو شام کہہ دینا بھی اُس کے لئے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

دیوالی کا تیسرا دیا تھا۔ تمام شہر میں چراغاں کی بہار۔ بڑی بڑی عمارتوں حویلیوں اور دکانوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ غریبوں کی جھونپڑیاں بھی چھوٹے چھوٹے چراغوں کی کانپتی ہوئی لَو سے روشن تھیں۔ گھر گھر خوشی تھی چپّے چپّے روشنی۔ بازاروں کی رونق اور دکانوں کی سج دھج۔ تماشائیوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں پھر رہی تھیں۔ سڑکوں پر تل دھرنے کو جگہ بھی نہ خرید و فروخت سے دکانداروں کو فرصت۔ عورتوں۔ مردوں۔ بوڑھوں اور بچّوں کی ریل پیل تھی۔ اور موٹروں۔ تانگوں کی یورش کان پڑی آواز نہیں آنے دے رہی تھی۔

شہر کے نوجوان سیٹھ کرشن کی کوٹھی بھی برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ عمارت کے چاروں طرف دیکھنے والوں کا ہجوم تھا اور اکثر لوگوں کی زبان سے نکل رہا تھا کہ کرشن نے سارے شہر سے بڑھ کر روشنی کی ہے۔ اگر آج کی رات لچھمی آسکتی ہے تو صرف اسی کوٹھی میں۔

کرشن اپنی کوٹھی میں موجود تھا۔ خاص اس کے کمرے میں بڑے کرّوفر سے کام لیا گیا تھا۔ اور ساری کوٹھی سے زیادہ آرائش کی گئی تھی۔ دوستوں کی گپ شپ جاری تھی طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔

یہ رام رنگی۔ راتوں کی راجدھانی۔ اور یہ روشنی کے مینار۔ ؟ سرکار پانچ روپے کی چال چلکر بولا۔

بھگوان سے بھی کچھ تعلق رہے۔ اچھا تو ہے۔ ؟ رمیش نے پتے پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

پھر تو آج پوجا پاٹ بھی ہونی چاہیئے۔ ؟ امیر چند نے نوٹ۔ ریزگاری اور پتے سمیٹتے ہوئے تجویز پیش کی۔

کوٹھی کو مندر ہی کیوں نہ بنالیا جائے ——— کرشن مسکرا رہا تھا۔

ایسے شرابی ڈھنڈاری کے ہاں لچھمی تو آنے سے رہی۔ ؟ پنڈت نیکی رام تصویروں کا گڈا میز پر پٹختے ہوئے ہنس پڑے۔

جی نہیں۔ وہ تو آپ جیسے دیوتاؤں کے ہاں آئے گی۔ سود در سود کا حساب جو چکانا ہے۔ ؟ کرشن نے ہلکی سی چٹکی لی۔

سب کے سب ہنس پڑے۔ اور پنڈت نیکی رام دھوتی سے عینک صاف کرتے رہ گئے۔

کھیل برابر ترقی کر رہا تھا دوست کھیلتے جاتے تھے مزے مزے کی باتیں کرتے جاتے تھے۔

دس بجے کے قریب کرشن انگڑائی لے کر اُٹھا اور برانڈے میں آگیا یہاں دھیمی دھیمی سبز روشنی تھی۔ اُس نے سگرٹ سلگایا اور دیا سلائی پھینک کر سامنے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں تھال لئے ہوئے آہستہ آہستہ چلی آرہی تھی۔ کرشن خوف زدہ سا ہو گیا۔ اُسے مدھم روشنی میں لچھمی کا شبہ ہو رہا تھا۔ وہ جس قدر قریب آتی گئی۔ یہ بُت بنتا گیا۔ خوف بھی موجود تھا شوق بھی دامنگیر تھا۔ وہ اُس کے نزدیک پہنچکر رُک گئی۔ کرشن پینے پلانے اور حُسن و بہار سے کھیلنے کا عادی تھا۔ نگاہوں کی پیاس بھی بڑھی ہوئی تھی۔ دل بھی کچھ کم پیاسا نہیں تھا۔ بہت سی کافرادائیں نظر سے گذر چکی تھیں جوانی کو جوانی کی نگاہ سے تولا تھا مگر رنگ و بُو میں ڈوبا ہوا اتنا حسین پیکر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لڑکی نہایت جمیل تھی۔ سرو قد۔ سیم تن۔ جوانی کی خوشبو میں بسی ہوئی۔ چاند سے چہرے پر کھیلتا ہوا بھولپن تھا۔ معصوم نگاہوں میں شباب کے ڈورے۔ وہ مبہوت سا ہو گیا۔ فضا کے سکون اور رات کے گداز میں اتنی دلکش لڑکی کو پاکر مبہوت ہو جانا یقینی تھا۔ کرشن

نیند نشے اور ناؤنوش میں سے کسی بھی شے کو یاد نہ رکھ سکا۔

سیٹھ جی کونسے کمرے میں ہیں — ؟ ایک رسیلی آواز تھی۔

تم کہاں سے آئی ہو ——— کرشن نے لفظوں کے موتی سے پروکر دریافت کیا۔

بڑے بابو جی کے ہاں سے ——— ؟ لڑکی سادگی سے پلکیں جھپکا کر بولی۔

وہ خود نہیں آئے ——— ؟

طبیعت خراب ہو ——— ؟

لڑکی آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ کرشن نے بیتابی سے روک لیا۔

مجھے سیٹھ جی سے ملنا ہے ——— ؟

مجھے بتا دیجئے کیا کام ہے۔ ؟

بابو جی کی طرف سے سلام کہنا اور یہ ...... لڑکی نے تھال کی طرف اشارہ کیا۔

آپ اُن کی ——— ؟

جی مَیں اُن کی لڑکی ہوں — ؟ وہ شرما گئی۔

لیکن ہم نے تمھیں کبھی نہیں دیکھا ——— ؟

لڑکی اس طرزِ بیان پر متعجب ہوئی ——— !

کرشن بھی سنبھلا ۔ !

ہم اور بڑے بابو جی ساتھ کام کرتے ہیں نا۔۔ — ؟

آپ ——— ؟

ہاں میں اس فرم میں اُن کا اسسٹنٹ ہُوں -!

سیٹھ جی اندر ہوں گے -؟

ہیں تو سہی پر پوجا پاٹ کر رہے ہیں۔کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے

اسی لئے مجھے یہاں کھڑا کیا گیا ہے -؟

مجھے دیر ہو جائے گی -؟

تھوڑی دیر میرے کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرو۔میں انھیں مطلع کئے دیتا ہوں -؟

وہ ساتھ ساتھ ہولی -کرشن کو سخت تعجب تھا۔رات کی خاموشی میں لڑکی اُس کے ساتھ بے محابا کیسے چلی آئی۔ اُسے بہت سی لڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا۔اور وہ ضرورت سے زیادہ چاق و چوبند نظر آئی تھیں۔کسی خیال نے اُس کے دِل میں زور سے چُٹکی لی۔ جسم میں پھُریری سی آگئی -

بیٹھیئے میں اطلاع کئے دیتا ہوں -؟

لڑکی نے کمرے پر نگاہ ڈالی -اور در و دیوار کی زیب و زینت میں اُلجھ گئی-

وہ فرماتے ہیں۔تھوڑی دیر اور ٹھہریئے - ؟

بہت خوب- لڑکی نے شکر گذاری کے ساتھ کہا-

تمھارا نام ـــــــ ؟ کرشن کے لب و لہجہ میں اشتیاق تھا-

مجھے رادھا کہتے ہیں - لڑکی نے نیچی نگاہ سے جواب دیا-

کرشن کے دل میں زندگی لہر مار گئی -اور غنچے سے کھلتے معلوم ہوئے -

زیور کا شوق نہیں ہے - ؟ اُس کے کان میں صرف دو مُرکیاں تھیں -

لڑکی نے بھولپن سے اُس کی طرف دیکھا۔جیسے وہ کہہ رہی تھی کنواری لڑکیاں

زیور نہیں پہنا کرتیں ۔؟

اوہ ۔ ابھی تک آپ کی شادی نہیں ہوئی ۔ ؟ کرشن دل کی دھڑکن کے ساتھ مسکرایا ۔

لڑکی کے ماتھے پر شکن آگئی ۔

بُرا مان گئیں ۔ ؟

نہیں تو ۔ پر ایسی بات پوچھنی نہیں چاہیئے ۔ ؟

بھول ہو گئی ۔ کرشن نے زبان دانتوں کے نیچے دبالی ۔

لڑکی شگفتہ ہو گئی ۔

آپ ــــــــ ؟ اُس کی نگاہ زمین پر تھی ۔

مجھے ستیش کہتے ہیں ۔ ؟

یہیں کام کرتے ہیں ۔ ؟

جی ۔ سیٹھ صاحب کے ہاں مُلازم ہوں ۔ کرشن قدرے سر جُھکا کر بولا ۔

وطن ــــــــ ؟

اِسی سرزمین کی خاک ہُوں ۔ !

لیکن میرے بابو جی کے کھاتے میں تو آپ کا نام درج نہیں ہے ۔ لڑکی نے ذہانت کا ثبوت دیا ۔

کرشن گھبرایا ــــــــ !

سیٹھ جی ۔ ؟ باہر سے کسی نے آواز دی ۔

وہ سُنی اَن سُنی کر گیا ۔ !

بے خبر ملازم نے اندر داخل ہو کر دیوالی کا ایک تار اُس کے ہاتھ میں دیدیا۔

آپ ——— ؟ لڑکی دم بخود تھی۔

کرشن مسکرایا۔ ؟

مجھے ستایا جا رہا تھا۔ ؟

نہیں نہیں۔ کرشن نے خوشامد سے کہا۔

پھر۔ ؟

تم سے اتنی باتیں کس طرح ہوتیں۔ تمھاری باتیں ——— ؟ کرشن کی آواز میں بوجھ تھا۔

لڑکی کو حجاب آگیا۔

بہت دیر ہو گئی۔ مجھے اجازت دیجئے۔ اب اُسے گفتگو کرنا بار تھا۔

ذرا اور ٹھہرو ——— ؟ کرشن کے دل میں شراب سے زیادہ مستی تھی۔

بہت رات ہو گئی۔ لڑکی نے بددلی سے کہا۔

کل بھی آؤ گی ——— کرشن نہیں اُس کا دل بول رہا تھا۔

کیوں ——— ؟ لڑکی کی آواز میں تمکنت شامل ہو چکی تھی۔

یونہی باتیں کریں گے سچ تمھاری باتیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ ؟

پھر وہی باتیں ——— ؟

ان باتوں میں کیا ہے۔ ؟ کرشن بھولا بھالا بچّہ دکھائی دے رہا تھا۔

زہر ——— وہ مسکرائی۔

ضرور۔ مگر وہ زہر جو میٹھا ہوتا ہے۔ ؟

اس کی مٹھاس اس زمانے سے چھینی جا چکی ہے - ؟

کرشن چُپ رہ گیا۔

اب جانے دیجئے ——— لڑکی نے التجا کی۔

کرشن نے ڈرائیور کو جگایا۔ وہ دن بھر کا تھکا ہوا بے فکری سے پاؤں پھیلائے سو رہا تھا۔

آیئے مَیں آپ کو پہنچا دوں۔ کرشن اُسے ساتھ لے کر کوٹھی کے دروازے پر آیا۔ تو ملازمین نے لڑکی کے پھول سے چہرے کو حسرت اور افسوس کے ساتھ دیکھا - ؟

کرشن سنجیدگی کے ساتھ اُسے موٹر میں بٹھا کر کمرے میں شرابی کی طرح داخل ہوا۔ دو گھنٹے میں اس کی دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔ اُس نے دوستوں کی ایک نہ سنی اور اپنا کمرہ بند کر کے لیٹ رہا۔

راستے میں لڑکی نے سوچا۔ کِتنا خوبصُورت نوجوان تھا۔ مگر سچ مچ دیوتا۔ رات بھی اُس کی تھی۔ بات بھی اس کی تھی۔ مگر کیا مجال جو اُس کے قدم ذرا بھی ڈگمگائے ہوں۔ اگر عام سیٹھ ساہوکاروں کی طرح وہ بھی بُرے فکر و فہم کا آدمی ہوتا۔ تو........ لڑکی کے جسم میں کپکپاہٹ تھی اور نگاہوں میں محبت کا دیوتا۔

دو دِن کے بعد وہی بھولی بھالی لڑکی اُس عظیم الشان کوٹھی کی رانی اور کرشن کی رادھا نظر آئی۔ دوستوں کو حیرت تھی کہ کرشن جیسا خود سر باغی انسان ایک دم شادی کے لئے کیسے راضی ہو گیا۔ وہ تو سماج اور مذہب کی ایک ایک بندش کو توڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ ڈرائیور۔ ملازم اور کارکُن بھی حیرت زدہ تھے۔ اب رادھا پر اُنھیں رحم آنیکی ضرورت نہیں تھی۔ وہ رادھا کے رحم و کرم پر تھے۔

کرشن کی جوانی کبھی تین چوتھائی رات سے پہلے کوٹھی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ مگر اب وہی کرشن تھا اور کوٹھی کی چار دیواری۔ سرکار۔ رمیش۔ امیر چند اور پنڈت نیکی رام اب بھی روزانہ آتے ہیں مگر کرشن رات بھیگتے ہی اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ دوست بڑی حد تک اُس میں تبدیلی پاتے ہیں۔ کبھی کبھی طعن طروز بھی کرتے ہیں۔ مگر کرشن مسکرا کر چُپ ہو جاتا ہے۔

پنڈت نیکی رام کرشن کو ستانے میں ہمیشہ آگے رہتے تھے۔ مگر اب کرشن کے سامنے بھیگی بلّی بنے رہتے ہیں۔ جب وہ سنجیدہ صُورت بنا کر روکھے مُنہ سے کہتا ہے۔

ایسے شرابی ڈھنڈاری کے ہاں چھمی تو آنے سے رہی ——— ؟ تو پنڈت نیکی رام کھسیانے ہو کر کہتے ہیں۔

صاحبزادے اگر ہم یُوں نہ کہتے تو تمہیں چھمی مِل ہی تو جاتی۔ ؟

اس پر فرمائشی قہقہہ پڑتا۔ اور کمرہ گونج جاتا۔

عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پبلک کی دھکا پیل تھی۔ اخباری نمائندوں کا جمگھٹا
سٹی مجسٹریٹ کسی کام سے جیل گیا ہوا تھا اور اُس کے آنے میں ذرا دیر تھی جس مقدمے
سے عام طور پر دل چسپی کا اظہار کیا جا رہا تھا اس کے متعلقین ضابطہ کے مطابق اپنی اپنی
جگہ کھڑے ہوئے تھے۔

مستغیث کے کٹہرے میں سیٹھ جی موجود تھے۔ میانہ قد۔ گورا رنگ۔ بڑی بڑی
موچھیں۔ کئی ملوں کے ناخدا۔ ایسی بہت سی تجوریوں کے مالک جن میں اَن گنت دولت

بھری رہتی تھی۔ مگر پاس پڑوسیوں اور اپنے بیگانوں کو ہمیشہ اُن سے شکایت رہی اور رہنی بھی چاہیئے تھی۔ اُن کی خود غرضی نے اپنی طرف دیکھنے کے سوا دوسرے لوگوں کی طرف اور لوگوں کے خدا کی طرف دیکھنے کی مہلت ہی کب دی تھی۔ خود اپنے لئے آپ مصیبت تھے دوسروں کو کیا خاک فائدہ پہنچا سکتے تھے۔

سیٹھ جی نے استغاثہ کیا تھا۔ کہ گذشتہ ہفتے کی اندھیاری رات کو اُن کا نوجوان موٹر ڈرائیور بہت سے زیورات اور نقد روپوں کے ساتھ اُن کی ناسمجھ حسین لڑکی کو بھگا کر لے گیا تھا جس کی پاداش میں اُس ظالم کو قرار واقعی سزا دی جائے اور لڑکی کو مال و دولت سمیت واپس دِلایا جائے۔

اخبارات سیٹھ جی کے انتخابی ہنگاموں اور ملوں کی ہڑتالوں پر بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ اُن سے پریس خوش تھا نہ پبلک راضی۔ یہی وجہ تھی کہ اب جو یہ حادثہ پیش آیا تو شہر بھر میں چرچے ہونے لگے۔ اخبارات نے چار چار کالم کی سُرخیاں لگانی شروع کر دیں اور یہ واقعہ اس درجہ لوگوں کی زبانوں پر کھیلتا رہا کہ اس مقدمہ کی پیشی ہوئی تو پبلک کام کاج چھوڑ کر کافی تعداد میں عدالت پہنچ گئی۔

مُلزم کے کٹہرے میں موٹر ڈرائیور تھا۔ ایک حسین خدوخال اور اچھّے رنگ روپ کا نوجوان۔ چہرہ پر تازگی۔ نگاہوں میں کسی نامعلوم شے کا خمار۔ وہ مُلزم تھا۔ الزام بھی معمولی نہیں تھا۔ مگر اس بے فکری سے کھڑا ہوا دکھائی دیتا تھا گویا وہ بھی اور تماشائیوں کی طرح ایک تماشائی ہے۔ عدالت کا خوف تھا نہ گردوپیش کی پروا۔ بیخودی کا سا عالم۔

نوجوان کو جُرم کی صحت سے انکار تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ہم آپس میں محبت کرتے ہیں۔ اور دونوں نے اپنی رضامندی سے شادی کی ہے۔ میری ترغیب نہیں تھی

انسانیت کا تقاضا تھا۔ سیٹھ صاحب پرلے درجے کے زر پرست آدمی ہیں۔ وہ اپنی ا
صاحبزادی کو بھی دَولت کی پتلی بنانا چاہتے تھے۔ مگر اس کی غیرت اپنے آپکو فروخت
کرنے پر تیار نہیں ہوئی اور اس نے نمائشی اعلیٰ زندگی پر عزت کی معمولی زندگی کو ترجیح
دی۔ وہ میری بیوی ہے۔ اُسے میرے ساتھ بھیجنے کا حکم صادر فرمایا جائے۔

آج لڑکی کا بیان ہونا تھا۔ جس پر آئندہ مقدمہ کا دارومدار تھا۔ وہ سرکاری
حفاظت میں تھی اور کسی مزید حادثے کے خوف سے فریقین میں سے کسی کے بھی سپرد
نہیں کی گئی تھی۔

حاکم آچکا تھا۔ پولیس کی نگرانی میں لڑکی کو لایا گیا۔ جس وقت وہ عدالت میں داخل
ہوئی ہے۔ تو لوگوں کی نگاہیں اُس پر جمی کی جمی رہ گئی تھیں۔ سترہ سال کی ایک پری
چہرہ لڑکی۔ صدمے کی وجہ سے مُنہ کا رنگ ذرا پھیکا پڑ گیا تھا۔ مگر اس پھیکے پن میں
بھی وہ بہار تھی کہ دیکھنے والی نگاہیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ کارروائی جاری ہوئی۔ لڑکی
کو بیان دینے کا حکم ہوا۔

اُس نے نیچی نگاہ سے کہنا شروع کیا۔

بچپن میں میری والدہ کا اِنتقال ہو چکا تھا۔ اور میں اپنی ننھیال میں پل بڑھ کر
جوان ہوئی اور ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے باپ کے پاس آگئی تھی۔ میرے نانا خدا ترس
آدمی تھے۔ اور انسان پر انسان کی حکومت پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ
اِنسانوں پر حکومت کرنا صِرف بھگوان کا کام ہے۔

سرکاری وکیل نے غیر متعلق بیان پر احتجاج کیا۔ !

ملزم کے وکیل نے واقعات کی تمام کڑیاں سامنے لانے کے لئے بیان جاری

رکھنے پر زور دیا۔!

عدالت نے لڑکی کو تفصیلات میں جانے کی اجازت دیدی۔

جب میں اپنے باپ کے گھر آئی ہوں تو یہاں انسانیت کا گلا پوری بیدردی سے گھٹتے دیکھ کر میری رُوح بلبلا گئی۔

بدترین قسم کی سرمایہ دارانہ ذہنیت۔ ذرا سی دیر میں مارکیٹ کا رُخ بدل ڈالنا۔ ایک اشارے میں چھوٹی چھوٹی پونجیوں کو ٹھکانے سے لگا دینا۔ میں نے بچّوں کی سی ضِد کے ساتھ باپ سے غریبوں پر رحم کھانے کی پیہم درخواستیں کیں اور خفیہ خفیہ غریبوں کی مدد کرتی رہی۔ باپ کا کاروبار جاری رہا۔ یہ میرے کام میں شریک تھے اور ان ہی کی معرفت اپنی والدہ کی جائداد سے مِلا ہوا رُوپیہ ضرورت مندوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ ہمیشہ اچھے ساتھی اور اچھے معاون ثابت ہوئے۔ اُس کا رُوئے سخن نوجوان کی طرف تھا۔ لڑکی کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ اُسے عدالت کے حکم سے پانی پلایا گیا۔

ایک روز ہمارے ہاں دیسی ریاست کا دیوان آکر ٹھہرا۔ وہ ادھیڑ عمر کا بدصُورت بھاری بھرکم آدمی تھا۔ میرے باپ نے دو دن مہمانداری کرنے اور رات رات بھر باتیں کرنے کے بعد میری شادی اُس کے ساتھ کر دینے کا وعدہ کر لیا۔ مگر جب اس رشتہ کا پس منظر سامنے آیا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنی ریاست کا سب سے بڑا ٹھیکہ دلوانے کی حرف دحکایت پیش کی تھی اور میرے باپ اس سودے کے لئے پُوری طرح تیار تھے۔ مَیں نے اپنے خاندان پر نگاہ ڈالی۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ سب روپے والے تھے۔ روپیہ سب کا ایمان تھا۔ مَیں نے آنسوؤں کے ذریعہ باپ کو اِس اِرادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر انھیں اپنے خوابوں کی شکست ٹھنڈے دل سے کیوں کر گوارا ہو سکتی

تھی۔ ہٹ دھرمی پر اَڑے رہے۔ اپنی کرنی میں کسر نہیں کی۔ مَیں نے احتجاج کے طور پر خاندان کی ایک سمجھ بوجھ والی مُعمّر خاتون سے شکایت کی تو وہ حیران ہو کر بولیں۔

"بیٹی شگون کی بات میں بدشگونی نہیں کرنی چاہیئے۔ اونچا گھر بھاگوانوں ہی کو ملا کرتا ہے۔"

شگون ——— ؟ لڑکی نے گہرے طنز کے ساتھ لفظ دُہرایا۔ باپ کی عزت کے سوال پر جان دی جا سکتی تھی مگر اغراض پر قربانی دینا شیطانی حماقتوں پر ایمان لانا تھا۔ میں نے سماج ماحول اور مذہب سے بغاوت نہیں کی ہے۔ اُن کی لاج رکھی ہو۔

اِس قسم کا احساس نوجوان ہی نے تو دلایا تھا۔ تاکہ دولت اور عورت دونوں پر قبضہ کیا جا سکے۔ ؟ سرکاری وکیل نے چابکدستی سے کام لیا۔ !

ہرگز نہیں۔ لڑکی نے برافروختہ ہو کر کہا۔ !

کیا اِس نوجوان نے ترغیب دیکر راتوں رات بھاگنے کے لئے مجبُور نہیں کیا تھا؟ عدالت نے لڑکی کو غور سے دیکھا تھا۔

اِس سوال پر وہ چُپ رہ گئی۔ عدالت کے پھر توجّہ دلانے پر بولی۔ یہ ساٹھ روپے کا موٹر ڈرائیور، غیر مذہب کا نوجوان اونچے گھر کی کسی بھی لڑکی کو بھگانے کی کیوں کر جرأت کر سکتا تھا۔ سچ جانیئے یہ مجھے بھگا کر نہیں لے گیا تھا۔ میں اِسے بھگا کر لائی ہوں۔ جو زیورات ساتھ لئے گئے ہیں وہ میری ماں کے ہیں اور میرے سوا اُن کا کوئی حق دار نہیں ہو۔

تم نے اس نوجوان میں کیا خوبیاں دیکھیں کہ کسی اونچے طبقے کے نوجوان کا ہاتھ پکڑنے کی بجائے اِس کے ساتھ چلی گئیں ——— ؟ سرکاری وکیل نے بھٹکے ہوئے سوار کی زبان میں پُوچھا۔ !

لڑکی کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے جھکیں اور اُس نے آہستہ سے چہرہ اُٹھا کر کہا۔ اونچے طبقے کے کِتنے ہی اپنے بیگانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر ہمیشہ اُن کی باتوں اشاروں اور نگاہوں میں شریر مسکراہٹ پائی گئی۔ مَیں نے اسی شہر میں بی۔اے پاس کیا ہے۔ اِن میں کیا بات ہے۔؟ وہ بات جس پر دیوتاؤں کو بھی رشک آسکتا ہے۔ ہم پہروں دنوں اور ہفتوں ساتھ رہے۔ لیکن اِن کی محبّت شرافت اور شائستگی نے کسی عالم میں بھی دم نہیں توڑا۔

عدالت میں کافی سنّاٹا تھا۔ عبرت سارے کمرے میں گھوم رہی تھی۔ حاکم نے بددلی سے کورٹ اِنسپکٹر کی طرف دیکھ کر مثل سررشتہ دار کی میز پر پٹخ دی۔ نوجوان کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ اور پولیس کے زیر سایہ لڑکی کو اُس کے ساتھ موٹر میں بٹھا دیا گیا